جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ

نومبر ۱۹۹۶ء

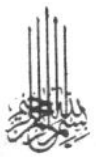

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماهنامه

انوار مدینہ

جلد : ۵ جُمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ ۔ نومبر ۱۹۹۶ء شمارہ : ۲

مدیر

سیّد محمود میاں

مدرس و نائب مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

بدلِ اشتراک		
پاکستان فی پرچہ ۱۰ روپے ------	سالانہ	۱۱۰ روپے
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات ---	″	۴۵ ریال
بھارت، بنگلہ دیش -------	″	۱۰ امریکی ڈالر
امریکہ افریقہ ---------	″	۱۶ ڈالر
برطانیہ ---------	″	۱۷ ڈالر

○ اس دائرہ میں سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ
ماہ . . . . سے آپ کی مدّتِ خریداری ختم ہوگئی ہے، آئندہ رسالہ
جاری رکھنے کے لیے مبلغ . . . . . . ارسال فرمائیں۔

ترسیلِ زر و رابطہ کیلئے دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور
کوڈ ۵۴۰۰۰ فون ۲۰۱۰۸۶-۷۷۲۴۲۷۳
فیکس ۹۲-۴۲-۷۷۲۴۷۰۲

○

سیّد رشید میاں طابع و ناشر نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

حرفِ آغاز		۳
درسِ حدیث	حضرت مولانا سید حامد میاںؒ	۶
رحمۃ للعالمینؐ اور سیاسی انقلاب	حضرتِ اقدس مولانا سید محمد میاںؒ	۱۰
حیلے اور بہانے	حضرت مولانا عاشق الٰہی بلندی شہری	۱۹
قاضی اطہر مُبارکپوریؒ	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	۲۵
تحفۂ اصلاحی	حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب	۳۵
علاقائی حقوق	حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب	۴۱
حاصلِ مطالعہ	حضرت مولانا نعیم الدین صاحب	۵۴
تقریظ و تنقید		۶۰
اخبار الجامعہ	محمد عابد متعلم جامعہ مدنیہ	۶۳

رابطہ: دفتر کراچی

حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہٗ، خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن کراچی

انڈیا میں رابطے کے لیے

حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب حمیدی مدظلہٗ العالی، مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد یو۔پی۔انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

سیّد محمُود میاں

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔ امابعد!

افغانستان میں رُوس کی ناکامی اور ذلّت آمیز انخلاء کے بعد افغان قوم کو جو عزّت و وقار حاصل ہُوا تھا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے امریکہ سمیت دیگر اسلام دُشمن قوتوں کی راتوں کی نیندیں اسی انقلاب کی بدولت حرام ہو چکی تھیں۔ دُنیا بھر میں عملی اسلامی انقلاب کی حامی قوتیں اس انقلاب کو فتح مبین کا پیش خیمہ قرار دے رہی تھیں اور وہ تمام توقعات جو اس جیسے انقلاب سے قائم کی جا سکتی ہیں قائم کیے ہُوئے تھیں مگر افسوس کہ رُوس کے افغانستان سے نکلتے ہی افغان قوم بہت سے گروہوں میں تقسیم ہو گئی اُن کا باہمی نزاع اس قدر شدّت اختیار کر گیا کہ نوبت خُون ریزی تک آ پہنچی، امریکہ اور دیگر کافر سلطنتیں موجودہ صورت حال سے بہت خوش ہیں اور سازش کے ذریعے اس کو مزید خراب کرنے کے درپے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ خود مسلمان اس سازش میں کافروں کے آلہ کار ہیں بالخصوص حکومتِ پاکستان تو ان سازشوں میں برابر کی شریک و سہیم چلی آ رہی ہے

فی الوقت افغانستان کے تازہ ترین حالات یہ ہیں کہ دو بڑی طاقتیں باہم برسرِ پیکار ہیں۔ ایک طاقت جس کی قیادت افغانستان کے سابق صدر برہان الدّین ربّانی سابق وزیرِ دفاع احمد شاہ مسعود اور سابق وزیرِ اعظم گلبدین حکمت یار کر رہے ہیں جبکہ دوسری طاقت کی قیادت ایک سپریم کونسل کر رہی ہے جو افغانستان کے بڑے بڑے جیّد علماء پر مشتمل ہے، یہ طاقت "طالبان" کے نام سے معروف ہے۔ تقریباً تین سال سے ماسوائے کابل اور جلال آباد اور کابل کے شمالی علاقوں کے افغانستان کا دو تہائی علاقہ اس کے زیرِ کنٹرول ہے

جہاں امن وامان کی صُورتِ حال اس درجہ تسلّی بخش رہی ہے کہ مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ شرعی عدالتوں کا قیام اور ان کے ذریعے حدود و قصاص کا نفاذ اُن کے سُنہری کارنامے ہیں۔ دو ماہ پیشتر طالبان نے سرکاری فوجوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کی جس میں اُن کو نمایاں کامیابیاں حاصل ہُوئیں اور سرکاری فوج کو بُری طرح پسپا ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں اُن کے ہاتھ سے پہلے جلال آباد نکلا اور اس کے چند ہی دنوں بعد طالبان نے ملک کا دارالحکومت کابل فتح کر لیا اور اپنی مخالف فوجوں کو کابل کے شمال میں دُور تک دھکیل دیا، صدر ربّانی وزیرِ اعظم حکمت یار اور وزیرِ دفاع احمد شاہ مسعود کابل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی بکھری ہُوئی قوت کو جمع کر کے احمد شاہ مسعود کی قیادت میں جوابی کارروائی کی جس میں طالبان کو بڑا جانی نقصان بھی اُٹھانا پڑا اور کچھ علاقوں میں پسپائی کا سامنا ہُوا حین التحریر کابل کو طالبان کے قبضہ سے نکالنے کے لیے دونوں فریقوں میں خوفناک کانٹے دار مقابلہ جاری ہے۔

مُسلمانوں کی ان دو جماعتوں کے درمیان اس لڑائی کو جہاد قرار دینا یا کسی ایک فریق کو باطل محض اور دوسرے کو برحق قرار دینا حتمی طور پر ممکن نہیں کیونکہ یہ فیصلہ تب ہی ممکن ہے کہ ہر فریق اپنے دعوٰی پر عمل کا موقع ملا ہو کیونکہ دونوں فریق مسلمان ہیں دعوٰی بھی دونوں کا اسلامی نظام کا نفاذ ہے، البتّہ اتنی بات بالکل واضح ہے کہ کسی بھی ملک یا ادارے کے تمام معاملات کا دارومدار اس کے "دستور" پر ہوتا ہے اچھی یا بُری چیز کو پائیداری دستور کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ دستور اگر غیر اسلامی ہو اور اس میں خرابی راہ پاتی ہو تو خرابی کو دستور کی وجہ سے دوام اور تقویّت حاصل رہے گی۔ صدر ربّانی کو اپنے چند سالہ دورِ اقتدار میں یہ موقع ملا تھا کہ وہ سب سے پہلے یہ بُنیادی اور اہم کام کرتے کہ ظاہر شاہ کے زمانے کا دستور معطل کر کے افغان عوام کی واضح اکثریت کے مزاج اور منشاء کے مطابق خالص اسلامی دستور تیّار کر کے اس کو افغانستان کا دستور قرار دیتے تاکہ یہ عمل ان کے اسلام سے سچّی لگن کے دعوے پر مہر تصدیق ثبت کرتا مگر اُنھوں نے اور اُن کے رفقاء نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے اُن کے دعوی کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔

البتّہ طالبان کو ایسا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اب اگر وہ کابل پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیتے ہیں تو سب سے پہلے اُن کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ غیر اسلامی دستور معطل کر کے اسلام کے عین مطابق ایک دستور افغان عوام کو دیں تاکہ ان کے اقدامات کی حیثیّت دستوری ہو محض ہوائی نہ ہو اور آئندہ کے لیے اقتدار میں آنے

والی ہر جماعت کے لیے غیر اسلامی فیصلوں اور اقدامات کے دروازے بند ہو جائیں، جب تک سابقہ غیر اسلامی دستور معطل نہیں ہو جاتا کسی بھی حکومت کے اسلامی اقدامات اور فیصلے ناپائیدار اور عارضی ہونگے اور سوائے خود فریبی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر طالبان کی سپریم کونسل یہ کارنامہ انجام دے دیتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دعوے میں واقعی مخلص ہے اور شک و شُبہہ سے بالا ہے۔ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت اُن کے ساتھ ہوگی۔ دُنیا و آخرت کی کامیابی اور فلاح ان کے قدم چُومے گی۔

آخر میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ فی الوقت ہر مُسلمان کا شرعی اور اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ مُسلمانوں کے درمیان جاری اس خُون ریزی کو روکنے کی اپنے تئیں بھرپُور کوشش کرے اس میں کوتاہی برتنا یا اس کو ہَوا دینا بہت بڑا گناہ اور حرام کام ہونے کے ساتھ ساتھ دُنیا و آخرت کی بربادی ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں محبّت و اتّحاد کے ساتھ عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین۔

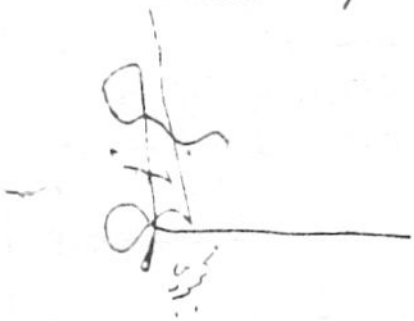

انتقالِ پُرملال

گزشتہ ماہ ۱۷/۱۸ اکتوبر کی درمیانی شب جمعہ میں نمازِ عشاء کی ادائیگی کے دوران جناب منصور الزّماں صاحب صدّیقی (صدّیقی ٹرسٹ کراچی) کی اہلیہ محترمہ وفات پاگئیں۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون، مرحومہ کا حسن خاتمہ قابلِ رشک ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی اُمّید ہے کہ مغفرت کا معاملہ فرما کر بلند درجات سے نوازا ہوگا۔ نمازِ جنازہ میں شریک افراد کی تعداد بھی قابلِ رشک تھی۔ تقریباً اسّی ہزار افراد نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

قارئین کرام سے ایصالِ ثواب اور دُعاء مغفرت کی خصوصی اپیل ہے۔ جامعہ میں بھی مرحومہ کے لیے بڑی تعداد میں ایصالِ ثواب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔ (ادارہ)

مولای صل وسلم دائما ابدا علی حبیبک خیر الخلق کلهم

درسِ حدیث

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کے زیرِ اہتمام ہر اتوار کو نمازِ مغرب کے بعد جامعہ مدنیہ میں "مجلسِ ذکر" منعقد ہوتی تھی۔ ذکر سے فارغ ہو کر حضرت رحمہ اللہ حدیث شریف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ ذکر و بیان کی یہ مبارک اور روح پرور محفل کس قدر جاذب و پُرکشش ہوتی تھی الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

محترم الحاج محمود احمد عارفؒ کی خواہش و فرمائش پر عزیز بھائی شاہد صاحب سلمہٗ نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے بہت سے دروس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لیے تھے اور پھر دروس والی تمام کیسٹیں انہوں نے مولانا سید محمود میاں صاحب کو عطا کر دیں۔

ہماری دعا ہے کہ جن کی مہربانی، توجہ اور سعی سے یہ انمول علمی جواہر ریزے ہمارے ہاتھ لگے، حق تعالیٰ اُن سب کو بیش از بیش اَجر سے نوازے۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ یہ قیمتی لؤلؤ لالہ "انوارِ مدینہ" کے ذریعہ حضرت رحمہ اللہ کے مریدین و احباب تک قسط وار پہنچاتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت کے خلفِ اکبر اور جانشین حضرت مولانا سید رشید میاں صاحب کے زیرِ اہتمام ذکر و درس کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ اَب بھی جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشاں است خم و خمخانہ با مہرو نشان است

کیسٹ نمبر ۱۲، سائیڈ بی ۶ جون ۱۹۸۲ء

الحمد للہ رب العٰلمین والصّلٰوۃ والسّلام علیٰ خیر خلقہ سیّدنا و مولانا محمّد وّآلہٖ واصحابہ اجمعین

امابعد! عَنْ اَنَسٍ اَوْ غَیْرِہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اسْتَاذَنَ عَلٰی سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ " فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ فَقَالَ سَعْدٌ وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَلَمْ یُسْمِعِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی سَلَّمَ ثَلٰثًا وَرَدَّ سَعْدٌ ثَلٰثًا وَلَمْ یُسْمِعْہُ فَرَجَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاتْبَعَہٗ سَعْدٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ مَا سَلَّمْتَ تَسْلِیْمَۃً اِلَّا وَھِیَ بِاُذُنَیَّ وَلَقَدْ رَدَدْتُّ عَلَیْکَ وَلَمْ اُسْمِعْکَ اَحْبَبْتُ اَنْ اَسْتَکْثِرَ مِنْ سَلَامِکَ وَمِنَ الْبَرَکَۃِ ثُمَّ دَخَلُوا الْبَیْتَ فَقَرَّبَ لَہٗ زَبِیْبًا فَاَکَلَ نَبِیُّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ اَکَلَ طَعَامَکُمُ الْاَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَیْکُمُ

الْمَلَائِكَةُ وَ اَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ"[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ یا اُن کے علاوہ کسی اور (صحابیؓ) سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت سعد بن عبادہؓ کے (یہاں پہنچ کر ان سے) گھر میں آنے کی اجازت طلب کی، چنانچہ آپ نے (دروازہ پر کھڑے ہوکر) فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، حضرت سعدؓ نے (گھر میں سے) جواب دیا وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ، لیکن اُنھوں نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ جواب سُنایا نہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تین مرتبہ سلام کیا، اور حضرت سعدؓ نے بھی آپ کو تین مرتبہ جواب دیا، لیکن آپ کو سُنایا نہیں، چنانچہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم (ان کا جواب نہ سُن کر) واپس لوٹ پڑے، حضرت سعدؓ نے جب یہ دیکھا تو وہ لپک کر گھر سے نکلے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پیچھے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ پر میرے ماں باپ قربان آپ نے جتنی بار سلام کیا میرے دونوں کانوں نے سُنا اور حقیقت یہ ہے کہ میں (ہر بار) جواب بھی دیتا تھا، البتہ مَیں اس جواب کو آپ کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتا تھا۔ کیونکہ میں آپ کے زیادہ سے زیادہ سلام و برکت کا خواہش مند تھا، چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت سعدؓ مکان میں داخل ہوئے، حضرت سعدؓ نے آپ کے لیے خشک انگور پیش کیے جن کو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کھایا، جب آپ کھا کر فارغ ہوئے تو (حضرت سعدؓ کے حق میں دُعا کرتے ہوئے) فرمایا: "اللہ کے نیک بندے تمہارا کھانا کھائیں۔ فرشتے تمہارے لیے استغفار کریں اور روزے دار تمہارے ہاں افطار کریں۔"

اسلام میں عام زندگی کے آداب بتائے گئے ہیں۔ روز مرّہ کے جو واقعات پیش آتے ہیں باتیں پیش آتی ہیں وہ بھی صحابہ کرام محفوظ رکھتے ہیں، اپنے واقعات جو اُن کے ساتھ گزرے قصّے جو اُن کے ساتھ گزرے وہ بھی اُنھوں نے محفوظ رکھے اور وہی پھر ہمارے لیے مسائل بن گئے کہ جناب نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ طریقہ بتلایا ہے اور یہ کر کے دکھلایا ہے

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۶۹

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کہیں جاؤ تو اجازت لو، یہ عام بات ہے ہر دن ہر گھر میں ہر آدمی کے ساتھ ہوتی ہے ہر مجلس میں ہوتی ہے، بے اجازت نہ جاؤ، باہر سے اجازت لو۔

ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو انصاری صحابی ہیں بڑے متمول ہیں اور مدینہ منوّرہ کے بڑے مخیر حضرات میں سے ہیں، اُن کے ہاں جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لے گئے، آپ نے اجازت چاہی کہ ہم آجائیں اندر۔ اس کا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ باہر ہی سے سلام کیا، سلام کے کلمات یہ تھے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ (اگر ایسی صُورت ہو کہ کہیں بہت بڑا دروازہ ہو کہ جہاں آواز جائے گی ہی نہیں فاصلہ بہت ہے گھنٹی بجانی پڑتی ہے۔ یہ تو الگ بات ہے باقی جہاں چھوٹی سی جگہ ہو، دیوار چھوٹی سی ہو، دروازے ایسے ہوں درزوں والے تو اس جگہ تو چلی جائے گی آواز۔)

سلام کا مطلب ہے سلامتی کی دُعا، وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ، اللہ کی رحمت تم پر ہو، اللہ کی طرف سے تم پہ سلامتی ہو یہ دُعا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اور یہ کلمات جنابِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مُبارک سے کسی کے لیے نکلنے یہ بڑی عجیب اور بہت ہی اُونچی بات ہے اور ہر صحابی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اپنے حق میں اچھے کلمات کا طالب رہتا ہے، اچھی نظروں کا طالب رہتا ہے۔ ذرا سا نظر میں فرق آئے تو اس کے لیے اس سے زیادہ بڑا غم کوئی نہیں ہوتا۔

حضرت سعدؓ کے دل میں یہ بات آئی کہ میں اگر جواب دوں زور سے تو آپ تک جواب پہنچ جائے گا اور اس صُورت میں مجھے باہر جانا چاہیے تو کہتے ہیں کہ پھر تو ایک ہی دفعہ سلام ہوگا تو اُن کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ تین دفعہ تک اجازت چاہی جائے۔ اگر تین دفعہ پر جواب نہ آئے تو واپس چلے جائیں۔ لہٰذا تین دفعہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ضرور سلام کریں گے اور اُنھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ جواب نہ دیں۔ یہ بھی دل نہ مانا کہ آپ سلام کریں اور جواب ہی نہ دیں اس لیے یہ کیا کہ سلام کا جواب تو دیا، لیکن آہستہ سے کہ آپ تک آواز نہ پہنچے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دوبارہ سلام کیا۔ پھر اُنھوں نے ایسے ہی کیا تیسری دفعہ پھر جواب دیا اور پھر باہر آگئے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تیسری دفعہ سلام کے بعد لوٹ چلے تھے۔ اِنہوں نے پیچھے سے جاکر روک لیا اور عرض کیا بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ سچے تھے صاف تھے عرض کرنے لگے میرے ماں باپ آپ پہ قربان ہوں مَا سَلَّمْتَ تَسْلِیْمَۃً اِلَّا وَھِیَ بِاُذُنَیَّ جب بھی جناب نے سلام کیا ہے میرے کانوں نے سُنا ہے۔ وَلَقَدْ رَدَدْتُّ عَلَیْکَ میں نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ وَلَمْ

اُسْمِعُكَ ۔ لیکن اتنی زور سے نہیں دیا کہ جناب تک آواز پہنچے، اور وجہ کیا تھی؟ اَحْبَبْتُ اَنْ اَسْتَكْثِرَ مِنْ سَلَامِكَ یعنی دل میں یہ تھا کہ آپ کا یہ لفظ جو ہے سلام کا یہ بار بار میرے بارے میں آتا رہے اور برکت زائد ہو، پھر یہ حضرات گھر میں تشریف لے گئے۔ اُنھوں نے کشمش پیش فرمائی۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کشمش تناول فرمائے، اور دُعا دی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دُعا دینی چاہیے اس آدمی کو جس کے آپ مہمان بنے یا جس نے مہمان نوازی کی، وہ دُعا اپنی طرف سے ہم بنائیں گے تو کچھ کی کچھ بنے گی، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو دُعا دی ہے وہ یہاں بتائی گئی ہے۔ اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ وَ اَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ ۔ تمہارا کھانا نیک لوگ کھاتے رہیں۔ فرشتے تمہارے لیے رحمت کی دُعا کرتے رہیں۔ تمہارے یہاں روزے دار افطار کرتے ہیں۔ یعنی تمہارے یہاں جو کام ہو کھانے پینے کا وہ ثواب سے خالی نہ رہے۔ ہر چیز میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ ثواب کا سبب بناتا رہے۔ یہ دُعا کی جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے، کئی چیزیں اس (حدیث شریف) میں آگئیں۔

ایک یہ کہ کسی کے یہاں جانے کا طریقہ کیا ہے؟ اجازت کا طریقہ کیا ہے؟ اگر اجازت نہ ملے تو پھر کیا ہے؟ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جو انبیاء کرام کے سردار ہیں اور سب بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اگر آپ بلا اجازت اندر داخل ہو جائیں تو کوئی کہہ نہیں سکتا کہ کیوں تشریف لائے ہیں۔ اور کوئی خفا نہیں ہو سکتا بلکہ خوش ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تین دفعہ اجازت چاہی اور پھر واپس تشریف لے جانے لگے وہ صاحبِ خانہ فوراً آئے اور اُنھوں نے پہچان لیا، پھر اس کے بعد آپ نے ناراضگی نہیں ظاہر فرمائی کہ یہ کیا طریقہ ہے اور اُنھوں نے جو بیان کیا اس پہ اعتماد بھی فرمایا کہ واقعی ایسے ہی ہوا ہوگا۔ اس سے اُن صحابی کے ایمان کی تائید نکلتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم (اگر وہ غلط ہوتے تو) اُن کی بات نہ سُنتے نہ مانتے آپ نے اُن کی بات کو مانا کہ واقعی ہی تمہاری نیت یہی تھی یہ تسلیم کر لینا اُن صحابی کے لیے تعریف کی بات تھی اور پھر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جو اُنھوں نے پیش کیا وہ تناول فرمایا۔

پھر یونہی اُٹھ کے چلے جانا نہیں ہے، بلکہ دُعائیہ کلمات کہنے کی تعلیم فرمائی کہ اس شخص کے حق میں جس نے تمہارا اعزاز و اکرام کیا ہے بٹھایا ہے کھلایا ہے۔ کلماتِ خیر کہنے چاہئیں۔ آقائے نامدار صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو کلماتِ خیر اس وقت فرماتے وہ اس حدیث شریف میں آرہے ہیں۔

(بقیہ بر صـ ۳۴)

قسط: ۲

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

اور

سیاسی انقلابات

ذیل میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ کی ایک نادر تحریر پیش کی جا رہی ہے جو آپ نے رحمۃ للعالمین اور سیاسی انقلابات کے عنوان سے لکھی تھی۔ آپ کی یہ تحریر عرصہ سے نایاب تھی حال ہی میں ادارہ کو ایک قدیم لائبریری سے دستیاب ہوئی تھی۔ (ادارہ)

خاص نکتہ

ہم بسا اوقات ضرورتوں سے پریشان ہوئے۔ بہت پریشان ہوئے۔ یکایک دل میں ایک بات آئی۔ بات کیا تھی گویا ایک شعاع تھی جس کی روشنی نے دل و دماغ منوّر کر دیا۔ یا ابرِ نیساں کا ایک قطرہ تھا۔ تشنہ لب جستجو اس کے چُوسنے کے لیے جھپٹی۔ اس کی حیثیّت سانس کی تھی جو انسان کو عطا ہُوا۔ ہم نے اس شعاعِ نُور کو یا قطرہِ رحمت کو خُوب بڑھایا، خُوب پھیلایا۔ جس طرح ہم سانس کو جتنا چاہتے ہیں بڑھاتے اور پھیلاتے ہیں۔

مگر سوچو، وہ شعاع کہاں سے آئی۔ وہ ابرِ نیساں کا قطرہ کہاں سے ٹپکا۔ ہمیں پیشتر سے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم اس کو پیدا کہاں سے کرتے۔

بلا شُبہ وہ فطرت کا ایک عطیہ ہے جس طرح ہمارا یہ سانس فطرت کا عطیہ ہے جو ہمیں فطرت نے اس وقت دیا کہ جب ہمیں اپنی خبر نہ تھی اور ہمارے وجود نے پُوری طرح جسمانی قوّت اور ہیئت بھی اختیار نہ کی تھی۔

فطرت کیا ہے ـــــ قانُونِ قدرت۔ دستورِ پیدائش ـــــ کیا یہ قانون خود بخود ہو گیا۔؟ اس کا واضع کون ہے؟ (یہ بڑی دلچسپ بحث ہے جو ہمیں اس واحد ہستی کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس نے نیست سے ہست کیا۔ وجود بخشا اور دُنیا کا یہ سارا نظام مستحکم اُصول پر قائم کیا۔ اگر یہ بحث ہمارے

موضوع سے خارج نہ ہوتی تو ہم اس کی تفصیل ضرور کرتے۔)

جامعہ بشریت یا انسانی اجتماعات کے مراتب

دُنیا کا کوئی انسان بھی آپ کو تنہا نہ ملے گا۔ لامحالہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر رہے گا۔ یہ یقینی بات ہے کہ سب کی طبعتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ سب کے لیے یکساں سہولتیں بھی میسّر نہیں آسکتیں کوئی عقل مند ہوتا ہے، کوئی بیوقوف، کسی کی طبیعت فطرۃً حسن پرست، نزاکت پسند، پاکیزہ ہوتی ہے کوئی اس کے بالکل برعکس

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونق چمن

کسی کو غور فکر، تجربہ اور امتحان کے موقعے پر میسّر آجاتے ہیں اور کوئی کوشش کے باوجود محروم رہتا ہے۔ اس تفاوت نے اجتماعی اُمور کو چند حصّوں پر تقسیم کر دیا۔

(۱) ایسے اُمور جن سے اولاد آدم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی بے نیاز نہیں۔ خواہ وہ دامنِ کوہ میں رہتا ہو۔ یا سمندر کے کسی ساحل پر۔ ہمالیہ کی چوٹی پر اس کا نشیمن ہو یا سائبریا کے جنگلات میں مثلاً (الف) زبان۔ جو اجتماعی ضرورتوں میں سب سے مقدم ہے۔ جس کے بغیر انسان اپنا منشاء دوسرے پر واضح نہیں کر سکتا۔ (ب) خوراک اور اس کے طریقے (ج) مویشی کو قبضہ میں کرنا۔ (د) ازدواجی تعلقات۔

(۲) لیکن ایسے پست ترین اجتماع، جن کی ضروریات زندگی، پتوں اور پہاڑ کے غاروں تک محدود ہوں۔ دُنیا نے شاید صرف اپنی ابتدا میں دیکھے ہوں گے۔ ہمارے سامنے جو اجتماع ہیں جن سے دُنیا کی سیاست بحث کر سکتی ہے۔ وہ کم از کم دیہاتی آبادی ہے۔

لیکن انسان کی ترقی پذیر فطرت نے اس پر بھی قناعت نہیں کی۔

محبّت اور اُنسیت اس کا شریف ترین جوہر تھا۔ جس نے اس کی اولاد کو اس سے جدا نہ ہونے دیا۔ تا آنکہ بچے باپ بن گئے اور ایک نسل کا اضافہ ہو گیا۔

مگر نسل کی زیادتی نے ان کے اجتماع کو تھوڑے ہی عرصہ میں دو چند سے چہار چند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹا گاؤں بڑا گاؤں بنا اور پھر وہ قصبہ ہو گیا۔

بسا اوقات ترقی پسند طبیعتوں نے اپنے گاؤں کے تھوڑے سے اجتماع کو پسند نہیں کیا۔ وہ بڑے گاؤں یا قصبہ میں چلا گیا۔ اُس کا وطن اگرچہ اس کے ذہن اور عقل کے فیوض سے محروم رہا، مگر

جہاں وہ پہنچا وہاں اس کی قدر ہوئی۔ طبیعت میں قدرتی طور پر جولانی پیدا ہوئی۔ وہ حکیم اور عقل مند کی حیثیت سے نمودار ہوا، موجد بنا، اور قصبہ کے تمدّن میں چار چاند لگا دیے۔

اسی قسم کی افزائشِ نسل اور پردیسیوں کی آمد نے بسا اوقات کسی قصبہ کو شہر بنا دیا۔ اب انسانی اجتماع کے چار مرتبے ہمارے سامنے آگئے۔

۱۔ جنگلی ۲۔ دیہاتی ۳۔ قصباتی یا شہری ۴۔ ملکی (یعنی شہروں کے باہمی تعلقات)

بنیادی مطالبات

جنگل سے گاؤں بنا۔ گاؤں سے قصبہ اور قصبہ سے شہر۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر لطف یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں میں کمی نہیں آتی۔ کھانے پینے۔ سایہ لینے گرمی حاصل کرنے۔ ازدواج وغیرہ وغیرہ کی حاجت پہلے سے تھی۔ مگر تیزیِ طبع نے کھانے میں کچھ تکلفات پیدا کر دیے۔ گھاس پات چھوڑ کر غلہ کھانا شروع کر دیا۔

یہ پہلا مرحلہ طے ہوا ہی تھا کہ پکانے کی رسم نکل آئی مگر ہاتھ پر پکانا ناممکن تھا تو برتن بنانے کی سوجھی۔ جو غلہ ہمارے سامنے جنگل کے خودرو پودوں سے حاصل ہوگیا تھا جو ہمیں اتنا پسند آیا تھا کہ ہم سب کھا گئے اس کا ہمیں پھر اشتیاق ہوا۔ جس کی بدولت رفتہ رفتہ فطری الہام نے کھیتی کا طریقہ سجھا دیا۔ اب ہل، کدال، ڈول، رسی وغیرہ وغیرہ تمام ہی چیزیں رفتہ رفتہ ہمارے ہاتھوں میں آگئیں۔

ہم نے ایک بچھڑا دیکھا۔ اچھا معلوم ہوا، پال لیا۔ جب بڑا ہوا تو ہماری آرام طلب طبیعت نے ہل کا جوا اپنے کندھے پر اُتار کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ گویا ہمارے مقابلہ پر مشین تھا۔ خوب ہل جوتا اب ہم اس کے عادی ہو گئے کہ جتنے جانور ہمارے قبضہ میں آسکیں ان کو اپنے قبضہ میں لاکر اُن سے وہ کام لیں جو خود نہ کر سکیں۔

ایک گائے کا بچّہ دُودھ پی رہا تھا۔ ہم نے امتحان کی غرض سے تھن کو منہ لگا دیا۔ وہ نہایت شیریں معلوم ہوا۔ تو اب دُودھ پینے کی ایک نئی سوجھی اور اتنی سوجھی کہ برادرانِ وطن نے تو اپنی ماں کو چھوڑ کر گائے ہی کو ماتا کہنا شروع کر دیا۔

جہاں گائے نہیں تھی وہاں اُونٹ، بکری وغیرہ سے یہی تجربہ عمل میں آیا۔

برہنہ رہنے میں کچھ پریشانیاں پیش آئیں۔ لڑکپن میں تو برہنہ رہے تھے۔ ہمیں کچھ احساس نہ تھا لیکن جوان ہونے پر حسینوں سے واسطہ پڑا۔ تو کچھ نئی دُنیا سامنے آئی اور اب ہم اپنی ماں بہن سے چھپنے

لگے۔ ہمارے پاس پتوں کے سوا کچھ نہ تھا، مگر وہ سردیوں میں بیکار تھے۔

ہم نے دوسرے حیوانات کو دیکھا کہ وہ اپنے لانبے لانبے بالوں اور مضبوط کھال کی بدولت سردی سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہم نے چاہا کہ ہمارے بدن کی کھال اُن جیسی ہو جائے، مگر اس پر ہمارا قابو نہ تھا تو ہم اس کے پیچھے لگ گئے اور جب وہ کسی طرح قابو میں نہ آیا تو اس کو مار کر اس کی کھال اُتار لی اور خود اپنا لباس بنا لیا۔

لیکن وہ بہت سخت تھی تو دفعتہً دل میں آیا کہ صرف بالوں کو کسی صورت سے کھال کی طرح بنا لو۔

فطری الہام نے ہماری امداد کی۔ ہمیں بٹنے کی سوجھ گئی اور پھر دوبارہ غور کیا تو ایک روشنی نے ہمارے دل و دماغ کو مسرّت سے بھر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم نے کھوٹیاں گاڑ کر تانا تنا اور پھر ان کے آڑے رُخ پر دوسرے ڈورے کو نکال کر کپڑے کی طرح بُننا اس فطری الہام کی بدولت معلوم کر لیا تھا۔

بلا شُبہہ اس وقت انسان کے پاس بہت سا سامان مہیّا ہو گیا۔

مگر مشکل یہ تھی کہ جس نے اپنا وقت کھیتی میں صرف کیا تھا اُس کو کپڑا بننے کی فرصت نہ مل سکی۔ برتن بنانے والا کھیتی نہ کر سکا۔

ہمارے پاس غلّہ تھا پڑوسی کے پاس کپڑا تھا۔ ہم اگر اس کو چھینتے ہیں تو وہ ہمارا غلّہ چھین لیتا ہے ہم سردی سے پریشان تھے، اور پڑوسی بھوک سے۔ دفعتہً طبیعت نے ایک جدید نور محسوس کیا۔ یہ ایک نیا فطری الہام تھا کہ غلّہ دے کر کپڑا لے لو۔ بات خُوب ہو گئی، مگر ایک نئی شاخ تبادلہ کی پیدا ہو گئی جو ترقّی کرتے کرتے خرید و فروخت اور تجارت کی موجودہ حد تک پہنچ گئی۔

بہرحال اس تمام کدو کاوش سے ہمارے پاس پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کا سامان فراہم ہو گیا۔

برابر کے جھونپڑے میں ایک حسینہ تھی۔ اس سے کچھ اُنسیت تھی۔ ایک دوسرا شخص آیا۔ اُس کو اُٹھا کر چلتا بنا۔ اس کا تعاقب کیا گیا تو وہ قتل و خُون کے لیے آمادہ ہو گیا۔ حالانکہ وہ حسینہ خود اُس کو پسند نہ کرتی تھی، مگر اس کی قوّت کے سامنے مجبور تھی۔

خیال یہ بھی ہُوا کہ اسی طرح حسینوں کی چوری کی جائے۔ وہ دلوں پر ڈاکہ ڈالتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود اُن پر ڈاکہ ڈالا جائے۔

مگر فکر یہ تھا کہ یہ چوری بہت زیادہ چغلخور ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب جیتا جاگتا بچّہ پیدا ہو گا تو اس کا کون متکفل ہو گا۔ عورتوں نے خود یہ سوال پیش کیا کہ اُن کی اور اُن کی اولاد کی ضروریات کا نازک وقت

میں کون ذمّہ دار ہوگا۔ اس سوال نے بہت زیادہ سرگرداں کر دیا۔

ہاں۔ مگر وہی غیبی نور پھر سامنے آیا، اور اب یہ ارادہ کر لیا گیا کہ حسینہ کے باپ سے معاملہ طے کر لو۔ ایک دو آدمیوں کو اور مددگار اور گواہ بنا لو۔ پھر اگر کوئی مزاحمت کرے گا تو بہت سے ساتھی اور مددگار ہونگے۔ ایک شریف خاتون رفیقہ حیات ہوگی۔ اولاد اپنی ہی ہوگی اور باعثِ سکون اور موجب مسرت ہوگی۔ بڑھاپے کے وقت مددگار ہوگی اور ہم بھی پھر خُوب کما کما کر اُس کو اچھّی طرح رکھیں گے اور اگر مرنے لگے تو اُسی کو اُس کا مالک بنا دیں گے۔

آج ہمیں بہت خوشی تھی۔ ایک رفیقۂ حیات میسّر آئی تھی اور ایسا سامان بہم ہوگیا تھا کہ ہم اگر مر بھی جائیں تو ہمارا نشان ختم نہ ہو۔ نوع انسان میں کوئی کمی نہ آئے۔ ہماری کمائی ٹھکانے لگے۔

ہم اس خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ ہم بہت خوش ہُوئے۔ دوست احباب کو جمع کیا۔ خُوب خُوب خوشیاں کیں۔ ولیمہ ہُوا، عمدہ کھانے پکے خُوب کھلائے گئے۔

اس تجربہ یا غیبی الہام نے بڑی حد تک عصمت۔ آبرو۔ بقاء نسل وغیرہ وغیرہ کی ضرورتیں اور اُن کے فوائد ہمارے سامنے روشن کر دیے۔

ہم نے تو یہ تمام باتیں کافی غور وخوض کے ساتھ کیں۔ فطری الہامات ہماری امداد کرتے رہے جن کا ہمیں کافی اعتراف ہے، مگر مصیبت یہ تھی کہ بہت سے حاسد، خائن، شریر، جنگجو، سرکش بھی انسانی طبقہ میں موجود تھے۔ اُن سے یہ تو نہ ہو سکا کہ جفاکشی اور انصاف پسندی سے کام لیتے۔

وہ اگرچہ صُورت میں انسان تھے، مگر سیرت میں بلا شُبہہ درندہ تھے۔ ان کمبختوں نے ڈاکہ زنی چوری، عیاشی، آبرو پر حملہ خُونریزی، فتنہ و فساد شروع کر دیا اور مصیبت پر مصیبت یہ کہ اس قسم کے بدمعاشوں کی ایک ٹولی اکھٹی ہوگئی جس نے زندگی دوبھر کر دی۔

ہم سب بہت پریشان تھے اور ہماری طرح وہ سب لوگ پریشان تھے جو ان بدمعاشوں اور سرکشوں کی ٹولی میں نہ تھے۔

یکایک اسی روشنی نے دل کو بقعۂ نُور بنا دیا جس کی شعاعیں بارہا کاشانہ دل پر پرتو ڈال چکی تھیں اور شاہراہِ تمدّن کی رہنمائی فرما چکی تھیں۔

خیال یہ کیا گیا کہ اس قسم کے تمام امن پسند شریف الطبع انسانوں کو فراہم کر کے باہمی امداد و تعاون اور ان سرکشوں کی مدافعت کا ایک معاہدہ کر لیا جائے۔

اپنی جماعت کا ایک نظام بنا دیا جائے اور اس کی نگرانی کے لیے ایک ایسے شخص کو جو اعلیٰ اخلاق کا بہترین نمونہ ہو۔ ناظم اعلیٰ مقرر کیا جائے تاکہ انسانیت پسند انسان امن اور عافیت کی زندگی بسر کر سکیں اور سرکش، ظلم پسند۔ اگر اصلاح نہ قبول کر سکیں تو ان کی سرکوبی اور ایسی گوشمالی ہوتی رہے کہ اُن کی فتنہ انگیزی جامعہ بشریت اور اجتماع انسانی کے لیے وہاں نہ ہو یہ تھا نظام حکومت کا سنگِ بنیاد۔ جو قائم کیا گیا تھا اس لیے کہ انسان اپنی زندگی سکون اور عافیت کے ساتھ گزار سکے۔ اور اطمینان کے ساتھ ان کمالات کی طرف توجّہ کر سکے۔ جن کے حاصل کرنے کے لیے اس کو انسانیت کا جامہ عطا فرمایا گیا ہے، اور اس کے درجہ کو عام جانداروں سے بالا رکھا گیا ہے۔

بیشک ایک شخص کو ناظم اعلیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس کی امداد کے لیے کچھ اور آدمی مقرّر کیے گئے تھے، مگر یہ سارا سلسلہ اس لیے تھا کہ انسانیت اور جامعہ بشریت کی ترقّی اور بہبودی ہو۔ یہ لوگ حاکم اس لیے تھے کہ امن و عافیت، بہبود و فلاح کی صُورتیں سوچیں اور تمام باشندے ان کی پیروی کر کے اعلیٰ فلاح حاصل کریں۔

یہ درحقیقت انسان تھے۔ اجتماعِ انسانی کے افراد اور اعضا تھے۔ انسانی حیثیّت سے ان کے حقوق عام انسانوں سے بالا ہرگز نہ تھے۔ دولت اور رفاہیت کے اتنے ہی مستحق تھے جتنے عام انسان۔ یہ مخدوم صرف اس لیے تھے کہ جامعہ انسانیت کے اعلیٰ خادم تھے۔ ان کی عظمت اس بناء پر کی جاتی تھی کہ حقوقِ انسانیت کے احترام و عظمت کے وہ محافظ تھے۔ شرافتِ انسانی کو دوبالا کرنا اُن کا فرض تھا۔ ہمدردی خلق اُن کا خاص منصب تھا، مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ نظام حکومت۔ جاہ اور شہرت کا ذریعہ بن گیا۔

کچھ محصولات عام لوگوں پر اس لیے مقرّر کیے گئے تھے کہ ان مخلص خادمانِ انسانیت کی ضروریات زندگی پُوری ہو سکیں، لیکن حریص اور طمّاع لالچیوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔

ان فتنہ انگیز۔ شہوت پرست۔ جاہ طلب۔ انسانوں نے جب امن پسند اور خادمِ خلق نظامِ حکومت کے مقابلہ میں شکست اُٹھائی تو اب دوسری چولی بدل کر میدان میں آئے۔ اغوا۔ دسیسہ کاری

اور خفیہ سازش کا جال اس کنارے سے اُس کنارے تک پھیلا دیا۔

وہ مخلص خادمانِ خلق پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ امن و سلامتی اور خدمت خلق کے نام پر "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔

بسا اوقات عام انسانوں نے دھوکا کھا کر اُن کی حمایت کی۔ اُن کو نظام حکومت میں شریک کرلیا۔ مگر افسوس وہ "مارِ آستین" ثابت ہوئے۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ نظام حکومت جو خدمت خلق اور جامعہ بشریت کی بہبود و فلاح کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ فرعونیت۔ شدادیت، نمرودیّت اور طاغوتیت کا جلوہ گاہ بن گیا۔

سب سے پہلے ان شیطان صفت انسانوں نے اپنے ماتحتوں کا گلا گھونٹا۔ جامعہ بشریت کے پرخچے اُڑا کر اس کو اچھا خاصہ جامعہ شیطانیت کرلیا۔ اور پھر ان کے حریص اور طماع حوصلے اور بڑھے۔ اپنے شہر سے گزر کر دوسرے شہر پر حملہ کر دیا۔ تاکہ شہوت رانی کے اسباب زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائیں۔

اور اس صورت سے ملک گیری اور شہنشاہیت کا وہ خبیث مرض پیدا ہوا۔ جس نے فرعون جیسے طاغوت سے موسیٰ علیہ السّلام جیسے مخلص خادم خلق کے مقابلہ پر نہیں بلکہ اپنے خالق اور پروردگار کے مقابلہ پر مصر کے تختِ شہنشاہیت سے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا نعرہ بلند کرایا۔

موت پر موت، مصیبت پر مصیبت یہ تھی کہ کالے گورے، عربی، عجمی، برہمن غیر برہمن، وغیرہ وغیرہ کی تقسیم نے انسان کو انسان کا دُشمن بنا دیا۔ اولاد آدم کو ایک دوسرے کے خُون کا پیاسا کر دیا۔

آپ بآسانی تسلیم کرلیں گے کہ انسان خیر اور شر کا مجموعہ ہے۔ جس طرح اس کو خدا نے عقل جیسا پاک جوہر عطا فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں طمع۔ حرص، حسد، بغض، کینہ وغیرہ وغیرہ کے وہ اخلاق بھی پیدا کر دیے ہیں کہ جو درندوں اور شیاطین کے خواص ہیں۔

بلا شُبہہ قدرت کا مطالبہ یہی ہے کہ انسان عقل اور روحانیت کو درندگی اور شیطانیت کے جذبات پر غالب کر کے ایک مقدس انسان کی حیثیّت سے جامعہ انسانی کا بہترین خادم بنے۔

مگر کتنے ہیں جو فطرت کے اس فطری مطالبہ کو پُورا کرتے ہیں۔

لیکن انسان اور کمزور انسان۔ جب شیطان صفت، جابر اور قہار درندوں سے جو اقتدار اعلیٰ کے مالک بن جاتے ہیں۔ گھبرایا کرتا ہے تو وہ لامحالہ پناہ پکڑتا ہے ایسے ہی پاکباز انسانوں کی جو اگرچہ

بہت تھوڑے ہوتے ہیں مگر مظلوم انسانوں کی حمایت سے وہ شیطانی گروہوں پر بہت بھاری ہوجاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خیر اور شر کی ایک جنگ چھڑتی ہے۔ مظلوموں کا ظالموں سے مقابلہ ہوتا ہے۔ کبھی وہ غالب کبھی یہ غالب اسی صورت میں دُنیا خیر و شر۔ انسانیت اور شیطانیت کی کارزار کا جولانگاہ بنی رہتی ہے۔

یہ تمام جنگ و جدال، قتل و خون۔ اُن مقاصد سے متعلق تھے جن کو سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے، مگر نظر اور فکر کا ایک پہلو اور بھی تھا جو انسان کے سامنے سب سے پہلے آیا۔

(۱) یہ فطری الہامات جو بار بار طبیعت میں آتے رہے کہاں سے آئے۔ یہ ایک سوال تھا۔

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ انسان کے ذہن میں دیکھی سُنی چیزوں کے عکس باقی رہ جاتے ہیں ان سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اور ضرورت کے وقت اُس عکس کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ کوئی الہام ہُوا۔

مگر بحث اس وقت کی ہے جب انسان تمدّن کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ اُس کے سامنے کوئی قصّہ کہنے والا بھی نہ تھا کہ اُس سے کچھ سُن کر ذہن نے اپنے خزانہ میں کچھ ڈال لیا ہو۔

(۲) اس سے مقدم سوال یہ تھا کہ اس کا سانس، اُس کی رُوح، اُس کی عقل کہاں سے آئی۔ یہ تمام عالم اور اس کا یہ مضبوط انتظام کس نے قائم کیا۔

ہم بہترین گھڑی سیکڑوں روپیہ خرچ کر کے منگاتے ہیں، مگر پھر بھی وہ تیز اور سُست ہوجاتی ہے اور بسا اوقات بند ہو کر ہمارا پروگرام بیکار کر دیتی ہے۔

لیکن یہ چاند اور سورج کی گھڑی غروب اور طلوع کے ٹائم لاکھوں برس سے اتنے مضبوط ہیں کہ دُنیا اِن ہی کے بھروسے پر جنتری بناتی ہے۔ نجومی ان کے اثرات سے اپنے تخیلات کا سارا گھروندا بنائے بیٹھے ہیں۔

اب سے ایک ہزار برس پیشتر۔ یکم جنوری کو جس منٹ پر دہلی میں آفتاب طلوع ہُوا تھا۔ کیا اس سال اُس کے سوا دوسرے وقت آفتاب طلوع ہُوا، اور کیا اس ایک ہزار برس کے بیچ میں کبھی کوئی فرق پیدا ہُوا۔

کوئی مشین دُنیا میں ایسی نہیں جس کا کوئی بنانے والا نہ ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ اس عالم کی تمام مشینری

بنانے والا کون ہے۔

خود انسان اگر اپنی ساخت پر نظر کرے تو حکمت کے لاتعداد اسرار اور معمے اُس کے سامنے آئیں جن کو حل کرتے کرتے وہ تھک جائے۔ صرف ایک انگلی پر نظر ڈالیے۔ اس میں پورا نہ ہو۔ تین پوروں کے بجائے صرف دو ہوں۔ یا سیدھی سلاخ کی طرح سخت یا گوشت کی طرح نرم ہو ناخن نہ ہوں۔ یا سارا پورا ہڈی کا ہو۔ اس کو کس قدر نقصان پہنچے گا، اور کیا دُنیا بھر کے ڈاکٹر اُنگلی کے کسی حصّہ کو بھی قدرتی اُنگلی کی طرح بنا سکتے ہیں؟ ایک آنکھ اس میں لاکھوں حکمتیں۔ اس کی نگاہ کس قدر تیز کہا جاتا ہے آنکھ سے ایک شعاع نکلتی ہے مگر خُدا کی پناہ اس کی حرکت کس قدر تیز ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ وقت میں جس کی کوئی مقدار نہیں بیان کی جا سکتی وہ لاکھوں اور کروڑوں میل کے فاصلہ پر تاروں سے جا ٹکراتی ہے اور اگر کوئی شعاع نہیں نکلتی بلکہ فوٹو کے چربے کی طرح کوئی طاقت ہے تب بھی محو اور اثبات کی طاقت کس قدر تیز۔ ایک سیکنڈ کے کم سے کم وقفہ میں آپ نے ایک طرف سے دوسری جانب نگاہ گھمائی۔ لاکھوں چیزوں کا نقش آپ کی نگاہ میں آتا اور مٹتا رہا۔ کس قدر تیز طاقت ہے، مگر کہاں سے پیدا ہوئی؟

ہر انسان کی صُورت ایک دوسرے سے جُدا۔ آواز جُدا، خصلت جُدا، طاقت جُدا، طبیعت جُدا۔

اگر بے حس حکمت اور ارادہ سے خالی کوئی مشینری کام کر رہی ہے تو یہ تفاوت کیوں؟ اس قسم کے سیکڑوں سوالات انسان کے سامنے آئے جس سے اس کی سرگردانی روز افزوں ہوتی رہی۔ اس نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔

"دُنیا کی ہر چیز اس کے لیے تھی اور وہ کسی کے لیے نہیں تھا"

پہاڑ اور اُن کی فلک بوس چوٹیاں دریا اور اُن کی بے پناہ گہرائیاں۔ جنگل اور اس کے تاریک جُھنڈ، ساری زمین اور وسیع میدان، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، شاداب گلشن، گل اور غنچے، فضا میں اُڑنے والے پرندے، سمندر کی مچھلیاں، ان سب کو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے لیے ہیں۔ جس کو چاہے جس کام میں لائے، کوئی روکنے والا نہیں۔

اگر کر سکے تو آفتاب کی کرنوں کو سمیٹے۔ اُن سے برقی طاقت بنائے۔ آسمانی فضا کو مسخر کرلے۔ دریا کی سطح کو جولانگاہ بنالے۔ سب جائز۔ اس کا فطری حق۔ یہ تمام چیزیں اُس کی اور اُس کے لیے۔

مگر آخر یہ کیوں پیدا ہُوا۔ اور کس کا ہے۔ کس کے لیے ہے۔ اس قسم کے سیکڑوں سوالات تھے جو پیدا ہوئے اور ہوتے رہے۔

(بقیہ بر صفحہ ۴۰)

حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مدظلہم

(قسط: ۷)

حیلے اور بہانے

بدعت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی

ان لوگوں کو یہ ہی معلوم نہیں کہ بدعت کسے کہتے ہیں، بدعت کا تعلق دینی اعمال سے ہے دُنیاوی انتظامات اور استعمالی اشیاء سے نہیں ہے، بدعت کا یہ مطلب کہ جو بھی کوئی چیز عہدِ نبوّت اور خلافت راشدہ میں نہ ہو وہ بدعت ہے، چاہے دنیاوی منافع کی چیزیں ہوں چاہے نئی ایجادات ہوں چاہے انسانوں کا وجود ہو یہ بالکل غلط ہے! بدعت کیا ہے؟ اس کو تو حضور اقدس صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود ہی ارشاد فرمادیا کہ مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالے جو ہمارے دین میں سے نہیں ہے تو وہ مردُود ہے[1]) معلوم ہُوا کہ بدعت کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو نئی نکالی جائیں اور دین میں داخل کی جائیں، بس ریل اور ہوائی جہاز کی مثال دینا بالکل جہالت کی بات ہے۔

پھر اگر ریل، ہوائی جہاز آپ کے نزدیک بدعت ہے تو آپ اس سے بچیں کیونکہ حدیث شریف میں تو کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ[2] فرمایا ہے یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، جو چیز بدعت ہے آپ اس سے پرہیز کریں۔ دوسروں کو الزام دینے سے خود بدعت کرنا کیسے جائز ہوجائے گا؟

جو کوئی عالم بتائے کہ تم بدعت کر رہے ہو اگر اس بتانے والے پر بھروسہ نہ ہو تو دوسرے کسی عالم سے پوچھو، جو واقعی عالم ہو اور بدعتیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی مرضی کے مطابق مسئلہ نہ بتاتا ہُوا اور

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص۲۷ عن ابی داؤد والترمذی وابن ماجۃ واحمد [2] ایضاً

جب کسی چیز کا بدعت ہونا ثابت ہو جائے تو اسے چھوڑ دو۔ کٹ حجتی اور اُلٹے سیدھے سوال و جواب کرنے سے بدعت نیکی نہ بن جائے گی، بلکہ وہ گناہ ہی رہے گی اور آخرت میں مؤاخذہ کی باعث ہو گی۔

بدعتِ حسنہ کی تاویل کا جواب

(۲۳) بعض لوگ اپنے عمل کو بدعت تو مانتے ہیں لیکن یہ کہہ کر پیچھا چھوڑا لیتے ہیں کہ یہ بدعتِ حسنہ ہے، حسب فرمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "کل بدعة ضلالة" ہر بدعت گمراہی ہے اور بدعت سیئہ ہے، کوئی بدعت حسنہ نہیں ہے، بعض چیزیں جن کو بعض علماء نے بدعتِ حسنہ کہہ دیا ہے وہ درحقیقت بدعت نہیں ہیں وہ سُنّتیں ہی ہیں۔

ان کی اصل عہد نبوت اور عہد صحابہؓ اور عہد تابعین میں ملتی ہے چونکہ ان کی صورت احوال کے اعتبار سے کچھ بدل گئی، اس لیے اس کو بعض عُلماء نے بدعتِ حسنہ کہہ دیا اگر بعض عُلماء نے بعض چیزوں کو بدعت حسنہ کہہ دیا ہو تو اس سے ہر بدعتِ حسنہ کیسے ہو جائے گی؟ جتنی بدعتیں ہیں ان کو اہلِ بدعت حسنہ ہی کہتے ہیں۔ اس طرح سے تو چودہ سو سال سے لے کر گویا اب تک کسی بدعت کا وجود ہوا ہی نہیں، بدعتوں میں مُبتلا رہیں اور ہر بدعت کو حسنہ کہتے جائیں۔ اس طرح سے تو کوئی بدعت بدعت نہیں رہتی۔ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "کل بدعة ضلالة" کا کوئی معنی و مصداق باقی نہیں رہتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ سینکڑوں سُنّتیں موجود ہیں۔ حدیث شریف کی کتابوں میں صحیح سند سے مروی ہیں ان کو چھوڑ کر خود تراشیدہ طریقوں کو اختیار کرنا اور بدعت حسنہ کہہ کر ان پر مضبوطی سے جمنا (جبکہ قرآن و حدیث کا بھرپور علم رکھنے والے ان کو بدعت بتا رہے ہوں) یہ کونسی سمجھداری اور دینداری ہے؟ آخر سُنّتوں پر چلنا کیوں ناگوار ہے؟ بس یہی بات ہے نا کہ نفسوں کو بدعتوں سے مانوس کر لیا ہے اور سُنّتوں پر چلنے کے لیے نفس راضی نہیں

ذوقِ بدعت سُنّتوں پر نہیں چلنے دیتا

بدعتوں کو تو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور ان کو عملی اعتبار سے فرض و واجب کا درجہ دے رکھا ہے، لیکن جب سُنّت پیش کی جاتی ہے تو یوں کہہ کر چھوڑ دی جاتی ہے کہ سُنّت ہی تو ہے، یہ سراسر

ایمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ سُنّت سے بچنا اور بدعت پر جمنا اور جو بدعت میں شریک نہ ہو اس کو نکّو بنانا اور یہ کہنا کہ یہ اہلِ سُنّت نہیں ہے، یہ عجیب جہالت کی بات ہے، جو بدعت سے بچے اور سُنّتوں پہ چلے وہ اہلِ سُنّت نہ ہو، اور جو بدعتوں سے چمٹے اور سُنّتوں سے بھاگے وہ اہلِ سُنّت ہوجائے یہ عقل کا دیوالیہ نہیں ہے تو کیا ہے۔

عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ بدعتوں کو چھوڑیں اور سُنّتوں کو اختیار کریں جن کا سُنّت ہونا صحیح السند روایات سے ثابت ہے اور جن کے سُنّت ہونے پر سب کا اتّفاق ہے۔ ایسے کام جو اپنے خیال میں بدعت حسنہ ہوں اور علماء حق کی تحقیق میں بدعت سیئہ ہوں آخرت کے مواخذہ اور محاسبہ سے ڈرنے والا تو ایسے کام کبھی نہیں کرے گا۔ جس میں ذرا بھی گناہ کا شائبہ و شبہہ ہو۔

اگر انسانوں کے کہہ دینے سے دین بن جایا کرے اور خود ساختہ اعمال پر ثواب ملا کرے تو قرآن و حدیث پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر اس کی اجازت دے دی جائے کہ جس کا جو جی چاہے طریقہ اختیار کرے اور اسے بدعت حسنہ کا نام دے کر عمل کرتا رہے تو دین اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتا۔ دین کی حفاظت اُنھیں حضرات نے کی ہے جو سُنّت و بدعت کا فرق سمجھتے اور سمجھاتے رہے ہیں۔

سمجھ داری کی بات تو یہ ہے کہ جس چیز کو ثواب سمجھ کر کر رہے ہیں اور اس کے نیکی ہونے کی صاف تصریح قرآن و حدیث میں نہیں ہے اور خود بھی اس کے بدعت ہونے کے اقراری ہیں۔ (گو بدعت حسنہ کے ہی نام سے اقرار کر رہے ہوں) اور عُلماء محققین اسے بدعت سیئہ بتا رہے ہیں تو اُسے چھوڑ دیں۔ آخرت میں ایسے اعمال لے کر پہنچنا عقل مندی اور سمجھ داری ہے جن پر بے کھٹکے ثواب ملنے کی اُمّید ہو اور جن اعمال پر کسی درجہ میں بھی گرفت کا اندیشہ ہو اُن سے پرہیز لازم ہے۔

مَارَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا کس کا قول ہے؟ اور اسکا مطلب کیا ہے؟

(۲۴) بہت سے لوگ اپنی بدعتوں کو نیکی بنانے کے لیے یہ عبارت پیش کرتے ہیں کہ مَارَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَاللّٰہِ حَسَنٌ اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہم مومن ہیں اور ہم نے یہ طریقہ نکالا ہے جسے ہم اچھّا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک بھی اچھّا ہے۔

جو حضرات اس عبارت سے اپنی بدعتوں کے بدعت حسنہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو

یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ کس کا قول ہے؟ پس جاننا چاہیے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، بعض حضرات نے اس کو حدیثِ مرفوع یعنی ارشادِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی بتایا ہے لیکن اس کی سند میں "سلیمان بن عمرو النخعی" ایک راوی ہے جس کے بارے میں محدّثین نے فرمایا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ یعنی اپنے پاس سے بنا لیتا تھا۔ لہٰذا حدیث مرفوع تو نہ ہوئی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا ہے اس کے بارے میں سمجھ لیں کہ ان کا کلام اتنا ہی نہیں ہے اس سے پہلے انھوں نے حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعریف فرمائی ہے پھر یہ کلمات ارشاد فرمائے، ان کا پورا ارشاد اس طرح ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ نَظَرَ فِیْ	بیشک اللہ تعالیٰ نے محمّد رسول اللہ
قُلُوْبِ الْعِبَادِ بَعْدَ قَلْبِ	صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قلب کے بعد
مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ	دوسرے بندوں کے قلوب کو دیکھا، پس
قُلُوْبَ اَصْحَابِہٖ خَیْرَ قُلُوْبِ	بندوں کے قلوب میں سے آپ کے صحابہؓ کے
الْعِبَادِ جَعَلَھُمْ وُزَرَاءَ نَبِیِّہٖ	قلوب کو سب سے بہتر پایا، پس وہ اپنے نبی
یُقَاتِلُوْنَ عَلٰی دِیْنِہٖ فَمَا رَاٰہُ	کے وزیر بنا دیے وہ آپ کی دین کی حفاظت کے
الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ	لیے جہاد کرتے ہیں، پس جسے مسلمین نے اچھّا
اللّٰہِ حَسَنٌ وَمَا رَاَوْہُ	سمجھا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھّا ہے اور جسے
سَیِّئًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ	مسلمین نے بُرا سمجھا وہ اللہ کے نزدیک بُرا
سَیِّئٌ[1]	ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا پورا ارشاد سامنے آنے سے پتہ چلا کہ ان کے ارشاد میں مسلمین سے مُراد حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ ہر کہ دمہ، بے علم اور بے عمل مدعی اسلام کو یہ درجہ دینا کہ وہ جو عمل چاہے ایجاد کر لے اور اس کا وہ عمل دینِ خداوندی میں داخل ہو جائے۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذہن میں کہیں سے کہیں تک بھی نہ تھی۔ فَمَا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا پر جو فا کلمہ داخل ہے، وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کلام پہلے کلام سے مرتبط ہے اور بطور عہدِ خارجی اس سے

---

[1] التعلیق الممجد علی مؤطا محمدؒ صـ۱۴۴

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مُراد ہیں۔ بڑی لمبی تفسیر و توضیح کے بعد جس کا کچھ حصّہ ہم نے اُوپر نقل کیا ہے۔

شارح مؤطا کا ارشاد

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ التعلیق الممجد علی مؤطا امام محمدؒ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فَاِذًا لَا یَدُلُّ الحدِیْثُ اِلَّا عَلٰی حُسْنِ مَا اسْتَحسنہُ الصَّحَابَۃُ اَوْ مَا اسْتَحْسَنَہٗ الْکَامِلُوْن مِنَ الْاِجْتِھَادِ لَا عَلٰی حُسْنِ مَا اسْتَحسَنَہٗ غَیْرُھُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ الَّذِیْنَ حَدَثُوا بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَۃِ وَلَاحَظَّ لَھُمْ مِنَ الْاِجْتِھَادِ مَالَمْ یَدْخُلْ ذٰلِکَ فِی اَصْلٍ شَرْعِی"۔

ترجمہ: پس اس تحقیق سے واضح ہُوا کہ حدیث صرف اس عمل کے حسن ہونے پر دلالت کرتی ہے جسے حضرات صحابہؓ نے اور اہلِ کمال مجتہدینؒ نے اچھّا سمجھا۔ ان حضرات کے علاوہ جو علماء قرون ثلٰثہ کے بعد آئے اور جن کو اجتہاد کا کوئی حصّہ بھی حاصل نہیں۔ ان کا پسند کیا ہُوا کوئی عمل حسن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ چیز کسی اصلِ شرعی میں داخل نہ ہو، نیز حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ بحث کے ختم پر لکھتے ہیں۔

"وَبِالْجُمْلَۃِ فَھٰذَا الْحَدِیْثُ نِعْمَ الدَّلِیْلُ عَلٰی حُسْنِ مَا اسْتَحْسَنَہ الصَّحَابَۃُ وَغَیْرُھُمْ مِنَ الْمُجْتَھِدِیْنَ وَ قُبْحِ مَا اسْتَقْبَحُوْہُ وَاَمَّا مَا اسْتَحْسَنَہٗ غَیْرُھُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ فَالْمَرْجِعُ فِیْہِ اِلَی الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَۃِ اَوْ اِلٰی دُخُوْلِہٖ فِی اَصْلٍ مِنَ الْاُصُوْلِ الشَّرْعِیَّۃِ فَمَالَمْ یُوْجَدْ فِی الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَۃِ وَلَمْ یَسْتَحْسَنہ اَھْلُ الْاِجْتِھَادِ وَلَمْ یُوْجَدْ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے علاوہ مجتہدین نے جس چیز کو اچھّا قرار دیا ہو وہ اچھّی ہے اور جس کو قبیح قرار دیا ہو وہ قبیح ہے، لیکن ان حضرات کے علاوہ دیگر علماء نے جس کو اچھا قرار دیا ہو تو اس کے لیے دو باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے، یا تو قرونِ ثلٰثہ میں موجود ہو۔ یا اُصولِ شرعیہ میں سے کسی اصل کے تحت داخل ہوتا ہو، پس جو چیز قرونِ ثلٰثہ میں نہ پائی

لَهٗ دَلِيْلٌ صَرِيْحٌ اَوْمَا يَدْخُلُ فِيْهِ مِنَ الْاُصُوْلِ الشَّرْعِيَّةِ فَهُوَ ضَلَالَةٌ بِلَا رَيْبٍ وَاِنِ اسْتَحْسَنَهٗ مُسْتَحْسِنٌ [1]

جائے اور اہلِ اجتہاد نے اس کو اچھّا نہ سمجھا اور اس کی کوئی دلیل صریح بھی موجود نہ ہو، یا اصولِ شرعیہ میں سے کسی اصل کے تحت میں داخل نہ ہوتا ہو تو وہ بلا شک و شُبہہ گمراہی ہے اگرچہ کوئی اچھا سمجھنے والا اس کو اچھا سمجھے۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ کوئی چیز حضرات صحابہؓ اور مجتہدین کاملین کے علاوہ کسی کے اچھّا سمجھنے سے اچھّی نہ ہو جائے گی۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بدعتوں کا ذوق رکھنے والے عام طور سے وہی ہیں جو قرآن و حدیث کے بھرپور علم سے محروم ہیں، چاہے پیری مریدی کرتے ہوں اور چوغے پہن کر اپنے کو عالم ہی ظاہر کرتے ہوں، اگر واقعی عالم بھی ہوں تو ائمہ مجتہدین کے بعد اُن کی تقلید نہیں کی جاسکتی، عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو بدعت و سُنّت کی تمیز ہی نہیں وہی بدعتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو جائز کرنے کے حیلے تراشتے ہیں، اُن میں جو دو چار نام کے عالم ہیں وہ دو چار سطر بھی کُتبِ حدیث میں صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

بدعت بہت بُری بلا ہے جو بدعتوں میں مُبتلا ہیں اُن کو توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا، بلا شُبہہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعت والے کی توبہ روک رکھی ہے، جب تک کہ وہ اپنی بدعت کو چھوڑ نہ دے (الترغیب والترہیب ص ۸۶ ج ۱ عن الطبرانی واسنادہ حسن)

بعض روایات میں ہے کہ ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کرا کر ہلاک کر دیا اور اُنھوں نے مجھے استغفار کر کے ہلاک کر دیا۔ جب میں نے یہ ماجرا دیکھا تو میں نے اُن کو اُن کی خواہشات کے ذریعہ ہلاک کر دیا (یعنی ایسے عقائد و اعمال میں لگا دیا، جو اُنھوں نے اپنی خواہش کے مطابق تجویز کر کے دین میں داخل کر لیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں لہٰذا استغفار نہیں کرتے (اور اس طرح گنہگار مرتے ہیں) (الترغیب والترہیب)

---

[1] التعلیق الممجد علی موطا الامام محمدؒ ص ۱۴۲ باب قیام شہر رمضان وما فیہ من الفضل

شخصیات

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

مؤرّخِ اسلام

مولانا قاضی اطہر مُبارک پوریؒ

"ماہنامہ دارالعلوم" دیوبند انڈیا کے اداریہ سے عالمِ اسلام کے نامور مؤرّخ حضرت مولانا قاضی اطہر مُبارک پوری رحمہ اللہ کی وفات کا علم ہوکر بہت دُکھ ہُوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول و منظور فرماکر آپ کے درجات بلند فرمائے۔ آپ کی وفات ایک سانحہ سے کم نہیں۔ آپ بانی جامعہ حضرت مولانا سیّد حامد میاں رحمہ اللہ کے والد محترم حضرت مولانا سیّد محمّد میاں رحمہ اللہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کے تفصیلی حالات ماہنامہ دارالعلوم دیوبند سے اخذ کرکے رسالے میں شائع کیے جارہے ہیں۔ (ادارہ)

پچھلے مہینے یہ جانکاہ خبر دِلوں پر صاعقہ بن کر گزری کہ ملک کے مشہور صاحبِ قلم عالم و محقق، مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مُبارک پوری ۲۷ صفر ۱۴۱۷ھ ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء بروز یک شنبہ تقریباً دس بجے شب میں اس سرائے فانی سے رحلت کرگئے (انا للہ و انا الیہ راجعون) اللّٰھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ و نقّہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

یُوں تو دُنیا کے اس مسافر خانہ سے سبھی کو ایک نہ ایک دن رختِ سفر باندھنا ہے، شب و روز کے ہنگاموں میں نہ جانے کتنوں کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ وہ ہم سے رُخصت ہوگئے۔ بہت سوں کی اس دائمی جدائی پر دِلوں کو شدید رنج و الم بھی ہوتا ہے، لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن کی رحلت کی خبر دِلوں پر بجلی گرادے، اور جن کی یاد ان لوگوں کے دلوں میں بھی ہوک اور سخت بے چینی پیدا کردے جو ان سے قرابت اور رشتہ داری کا رسمی رابطہ نہیں رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مولانا قاضی اطہر مُبارک پوری کو اپنی رحمتوں میں شرابور کرے، وہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی زندہ دلی اور وسیع علمی خدمات کی وجہ سے علمی دُنیا میں ہر دل عزیز شخصیّت کے مالک تھے اور جو شخص بھی علم و تحقیق کی کچھ قدر و منزلت اپنے دل میں رکھتا ہے اس کے لیے بلاشبہ قاضی صاحب کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔

ان کی وفات اگرچہ پوری علمی دُنیا کے لیے ایک ایسا حادثہ ہے جسے تادیر بھلایا نہیں جا سکے گا، لیکن اس ناچیز کے لیے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے ان کے قریبی اعزّہ کے لیے اس لیے کہ وہ اس ناچیز پر اس درجہ شفیق و مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا بیان ممکن نہیں کم و بیش پچیس سال تک قاضی صاحب کی صحبتیں نصیب رہیں، صرف علمی محفلوں میں نہیں، نجی مجلسوں اور سفر و حضر میں ان کی معیت نصیب ہوئی۔ ہر حال میں مرحوم کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں کو نظر انداز کر کے مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بتکلّف نہیں، بلکہ بتلطف چھوٹے بن جاتے تھے۔ قاضی صاحب ہی کی بے پناہ شفقتوں اور مخلصانہ ہمّت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔ جزاہ اللہ عنی وعن العلم خیر الجزاء

سادگی و بے تکلفی، کُتب بینی کا ذوق، مطالعہ کی وسعت، کتابیں جمع کرنے کا بے پایاں جذبہ، پاکیزہ شعری مذاق، عُلمائے اُمّت و سلف صالحین کے تذکروں سے عشق کی حد تک شغف، عُلمائے دیوبند کے مسلک پر تصلب کے باوجود دوسروں کے ساتھ توسع و رواداری خوردوں کی ہمّت افزائی اور اُنھیں آگے بڑھانے کا بے لوث جذبہ اور ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں مشغولیّت وغیرہ قاضی صاحب کی کتابِ زندگی کے وہ دل کش ابواب ہیں جن سے خود اُن کی شخصیت رعنائیوں کا مرقع بن گئی تھی۔

تاریخِ ولادت

قاضی صاحب ۴ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڑھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری نے "عبد الحفیظ" نام رکھا، مگر وہ اپنے قلمی نام قاضی اطہر مبارک پوری ہی سے مشہور و معروف ہوئے اور اصل نام اس طرح متروک ہو گیا کہ اب کم ہی لوگ اس سے واقف ہوں گے۔

طلب و تحصیل

قصبہ کے اساتذہ سے قرآن مجید، اُردو زبان اور ریاضی وغیرہ کی مکتبی تعلیم مکمل کر کے ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی تعلیم کا آغاز کیا اور وہاں کے اساتذہ مولانا مفتی محمّد یٰسین مبارک پوری، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا بشیر احمد مبارک پوری، مولانا محمّد عمر مبارک پوری وغیرہ سے نحو، صرف، ادب

بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ، اُصولِ فقہ وغیرہ مروّجہ نصاب کی تمام کتابیں پڑھیں۔ ان اساتذہ کے علاوہ اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری سے عروض و قوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے۔ قاضی صاحب کی علمی تربیت میں مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا بڑا حصّہ ہے قاضی صاحب میں کتب بینی اور مطالعہ کا چسکہ پیدا کرنے والے اصل میں یہی ہیں۔ نئی نئی کتابیں لاکر قاضی صاحب کو دیتے اور اس کے مطالعہ پر اُنھیں اکساتے اس طرح رفتہ رفتہ کُتب بینی اُن کی عادتِ ثانیہ بن گئی۔

مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مروّجہ نصاب مکمّل کر لینے کے بعد جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مراد آباد کا علمی سفر کیا اور فخر المحدثین مولانا سیّد فخر الدین احمدؒ شیخ الحدیث سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابو داؤد، اور مولانا سیّد محمد میاںؒ دیوبندی ثم دہلوی سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل سنبھلی سے صحیح مسلم وغیرہ کُتب حدیث پڑھ کر ۱۳۵۹ھ میں فارغ التحصیل ہُوئے۔

ذوقِ مطالعہ

قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کُتب بینی کا شوق تھا۔ اُنھوں نے اپنی مختصر خودنوشت سوانح حیات "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" میں لکھا ہے:

> "غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون و دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی حتّٰی کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب دیکھتا تھا... بعض اساتذہ ازراہِ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر زیادہ نہ پڑھو ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تو میں عرض کرتا کہ اگر ایسا ہوا تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا۔ کثرتِ مطالعہ اور کُتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی... اور چکر آنے لگتا تھا۔" (ص ۲۱-۲۲)

اسی ذوقِ مطالعہ کی یہ برکت تھی کہ قاضی صاحب نے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں دیکھ لی تھیں اُنھوں نے خود درجِ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

فہرست ابن ندیم، وفیات الاعیان، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، دلائل النبوۃ، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، آکام المرجان فی احکام الجان، حیاۃ الحیوان، الصواعق المحرقۃ، العمدۃ فی الشعر ونقدہٗ، الحاسن

والاضداد، الشعر والشعراء، المیزان الکبریٰ سیرت ابن ہشام وفاء الوفاء، المستطرف، دیوان فرزدق، کتاب الملل والنحل، العقد الفرید، رسالۃ الغفران تہذیب التہذیب، توالی التاسیس وغیرہ۔

اس فہرست کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا... اسی طرح جمعیۃ الطلبہ (مدرسہ احیاء العلوم کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔" (ص ۲۳-۲۴)

اس فہرست کو ملاحظہ کیجیے اور بتائیے کہ آج کے ہمارے وہ فضلاء جو کسی اور کام میں نہیں بلکہ علمی مشغلہ میں لگے ہوتے ہیں۔ ان میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے ان کتابوں کو دیکھا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے بہت سوں کو ان کتابوں میں سے اکثر کا نام بھی معلوم نہ ہوگا تو میرا خیال ہے کہ یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

اسی ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ قاضی صاحب کا سینہ معلومات کا گنجینہ بن گیا تھا، جو بعد میں ان کے نوک قلم سے رواں ہوکر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوگیا جسے دیکھ کر ایک خلقت اُنھیں مؤرخ اسلام کہنے پر مجبور ہوگئی اور بلا شُبہہ قاضی صاحب کو یہ حق تھا کہ وہ جگرؔ مرحوم کے الفاظ میں کہیں۔ ؎

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

درس و افادہ

علوم و فنون کی تحصیل سے رسمی فراغت کے بعد تعلیم و تدریس سے جدید علمی سفر کا آغاز کیا۔ اور اپنی مادر علمی مدرسہ احیاء العلوم مُبارک پور میں چار پانچ سال تدریسی خدمت انجام دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسی کا یہ اوّلین تجربہ شاید کچھ مناسب نہیں ثابت ہوا جس کی جانب خود قاضی صاحب نے نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"مدرّسی کا یہ چار پانچ سالہ دَور میرے حق میں صبرِ ایُّوب اور گریۂ یعقوب کا دَور تھا۔" (ص ۴۹)

انجام کار احیاء العلوم سے علیحدہ ہوکر نومبر ۱۹۴۴ء میں "مرکز تنظیم اہلِ سُنّت امرتسر" سے وابستہ ہوگئے

جہاں اُنھوں نے ردِّ شیعیت اور ردِّ قادیانیت سے متعلق اہم مضامین و مقالات سپردِ قلم کیے۔ پھر "زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور" کے اصرار بے حد پر "مرکزی تنظیم اہلِ سُنّت امرتسر" سے الگ ہوکر "زمزم کمپنی" سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۴۶ء تک مسلسل اس میں کام کرتے رہے اس مُدّت میں کمپنی کی جانب سے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتّب کی افسوس کہ یہ گرانقدر علمی سرمایہ تقسیم ہند کے ہنگامہ کی نذر ہوگیا۔

زمزم کمپنی سے وابستگی ہی کے دوران قاضی صاحب کے والد ماجد فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین کے سفر پر گئے تو خانگی ضروریات کے لیے تقریباً تین چار ماہ گھر پر رہے اور عارضی طور پر چند اسباق احیاء العلوم میں پڑھاتے رہے۔ پھر جنوری ۱۹۴۷ء سے ملک کے مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیرِ نگرانی روزنامہ زمزم لاہور میں اخبار نویسی اور صحافت کی خدمت انجام دی۔ اور تقسیم ملک سے کچھ پہلے فارقلیط کی معیت میں اس خیال سے وطن آگئے کہ تقسیم کے ہنگامہ کے بعد واپس آجائیں گے، مگر حالات نے دوبارہ لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔

۱۹۴۸ء کی ابتداء میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم سیکرٹری حکومت یو پی کی نگرانی میں بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار "انصار" جاری کیا، مگر یہ اخبار حکومت کے عتاب کی وجہ سے سات آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اس لیے بہرائچ سے منتقل ہوکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے آئے اور پورے ایک سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ اپنی مشہور تصنیف "رجال السند والہند" کی تدوین کی ابتداء ڈابھیل کے زمانۂ قیام ہی میں کی تھی۔

عرصۂ تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً آٹھ سال مبارک پور، امرتسر، لاہور، بہرائچ، ڈابھیل کے تعلیمی و صحافتی اداروں میں رہ کر تدریس، صحافت، مضمون نگاری اور شعر گوئی میں گزر گئے۔

بمبئی میں قیام اور تصنیفات کا سلسلہ

ان مختلف تعلیمی و صحافتی اداروں کے تجربات سے اُنھیں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ ان کا اندر بیٹھا ہوا فرہادِ علم ان اداروں کے رسوم و قیود کا پابند نہیں رہ سکتا اس لیے اُنھوں نے طے کیا کہ ان اداروں کی نگرانی سے آزاد ہوکر کسی جگہ جم کر یکسوئی کے ساتھ تصنیفی و تحقیقی کام میں لگ جانا چاہیے، لیکن خانگی ضروریات اور معاشی مسائل سے صرفِ نظر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس چکّی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن جاری رکھنے کے لیے

سرزمین بمبئی سب سے زیادہ موزوں نظر آئی چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ بمبئی پہنچ گئے۔ جسے خود اُنھوں نے اپنے علمی سفر کی آخری منزل کہا ہے۔ ابتداء میں دفتر جمعیۃ عُلماء صوبہ مہاراشٹر میں فتویٰ نویسی کی، پھر جون ۱۹۵۰ء میں جب روزنامہ جمہوریّت کا اجراء ہُوا تو نائب مدیر کی حیثیّت سے اس سے وابستہ ہوگئے مگر یہ وابستگی تادیر قائم نہ رہ سکی اور ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ قاضی صاحب کو اس سے علیحدہ ہوجانا پڑا اس کے بعد "روزنامہ انقلاب بمبئی" سے منسلک ہوگئے اور "جواہر القرآن" نیز "اُحول ومعارف" کے عنوان سے علمی، تاریخی، سیاسی موضوعات پر مشتمل روزانہ دو تین کالم لکھتے رہے یہ سلسلہ چالیس سال کی طویل مُدّت تک جاری رہا جو صحافت کی تاریخ میں ایک ریکارڈ کی حیثیّت رکھتا ہے۔

پھر ۱۹۵۲ء میں تنظیم خدام النّبی کی زیرِ نگرانی "ماہنامہ البلاغ" جاری ہُوا تو اس کی ادارت میں شامل ہوگئے، تقریباً بیس پچیس سال تک یہ مجلہ قاضی صاحب کی ادارت میں جاری رہا جو علمی حلقہ میں وقعت و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ملک کے مؤقر رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ناچیز سب سے پہلے اسی ماہنامہ البلاغ کے ذریعہ غائبانہ طور پر قاضی صاحب سے متعارف ہُوا، ان قلمی مصروفیتوں کے ساتھ دس سال تک انجمن ہائی اسکول بمبئی میں دینیات واخلاقیات کی تعلیم دی۔

قاضی صاحب کی ساری مصروفیات اگرچہ یک گونہ علمی ہی تھیں، مگر دراصل ان کا تعلّق "چکّی کی مشقت" سے تھا جو اہل وعیال اور خانگی ضروریات کے لیے ناگزیر تھیں، ان کا اصل کام وہ تھا جسے وہ ایک معمولی سے حجرے میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے۔ قاضی صاحب خود لکھتے ہیں۔

> "تیس سال سے زائد مُدّت تک بمبئی میں قیام رہا جس شہر میں "شبلی مرحوم" کنارِ آبِ چوپاٹی وگل گشتِ اپالو" کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکزِ علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف وتالیف اور مضمون نگاری ومقالہ نویسی کا دورِ شباب گزارا... بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کُش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا۔ اس لیے مَیں نے دولت وثروت کے اس "اندرونِ قعرِ دریا" میں تیس سال سے زائد "تخت بند ہونے کے باوجود" اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب وہند کے

ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی و اردو میں متعدّد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔" (ص ۵۱ - ۵۲)

قاضی صاحب نے تحقیق و تصنیف کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ اُردو زبان کے لیے بڑی حد تک اجنبی ہونے کے ساتھ بظاہر خشک تھا، لیکن اسی خشک اور سنگ لاخ زمین میں اُنھوں نے علم و تحقیق کے ایسے ایسے خوشنما و دل کش بیل بوٹے سجا دیے اور اپنی تاریخی و تحقیقی تحریروں میں ادب کی چاشنی اس طرح پیوست کر دی کہ وہ ایک دل چسپ اور شگفتہ موضوع بن گیا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی شگفتگی اور معلومات و تحقیقات کی رعنائیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ جب تک کتاب مکمّل نہ ہو جائے اُسے چھوڑتا نہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے ان کی کتاب "خلافت عبّاسیہ اور ہندوستان" کے مقدمہ میں کتنی صحیح اور مبنی بر حقیقت بات لکھی ہے کہ

"واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے، ان کی ان گرانقدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا اور نادر خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب منزل مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ لے کر آئے۔" (ص ۵۵۹)

عرب و ہند تعلقات پر اُردو میں مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی گرانمایہ تصنیف "عربوں کی جہاز رانی" میں ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ مولانا موصوف نے اس وسیع اور پھیلے ہوئے موضوع کو ایک خاص عنوان میں محدود کر دیا تھا اس لیے وہ اپنے موضوع کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے زیادہ گفتگو کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب نے اس موضوع کو وسعتوں کو محدود کرنے کی بجائے اس کی عمومیت اور ہمہ جہتی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے ہر ہر گوشہ پر تفصیلی نظر ڈالی ہے اور مطالعہ کی وسعت اور ذہنِ رسا کی برکت سے بیش بہا اور معلومات کا ایک ایسا سدا بہار علمی گلستان سجا دیا ہے جس کی رعنائیوں میں ماہ و سال کی گردش سے اضمحلال آنے کی بجائے مزید تازگی و شگفتگی بڑھتی جائے گی۔

اس خاص موضوع کے علاوہ قاضی صاحب نے تاریخ اور طبقات و رجال کے موضوع پر نہایت وقیع اور پُراز معلومات کتابیں تصنیف کی ہیں جو علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور عام طور پر علمی و تحقیقی کام کرنے والے ان سے استفادہ کرتے ہیں اور آج ان کی اکثر کتابیں بطور حوالے کے استعمال ہوتی ہیں یہ رتبۂ بلند عام طور پر کم ہی مصنّفین کو نصیب ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں قاضی صاحب کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ کیجیے جس سے ان کے کام کی اہمیّت اور وسعت و گہرائی کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

اُردُو تصانیف

(۱) عرب و ہند عہد رسالت میں (۲) خلافت راشدہ اور ہندوستان

(۳) خلافت امویّہ اور ہندوستان (۴) خلافت عبّاسیہ اور ہندوستان

(۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں

ان پانچوں کتابوں کے متعدّد ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہو چکے ہیں۔ نیز مصر کے نامور ادیب و عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزّت نے پہلی اور آخری کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے مصر سے شائع کیا۔

(۶) اسلامیٔ ہند کی عظمت رفتہ (۷) دیار پورب میں علم اور علماء (۸) مآثر و معارف

(۹) آثار و اخبار (۱۰) مختصر سوانح ائمۂ اربعہ (۱۱) تاریخ تدوین سیر و مغازی

(۱۲) خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت۔

(۱۳) خواتین اسلام، دس سے تیرہ تک یہ چاروں کتابیں شیخ الہند اکاڈمی دارالعلوم دیوبند نے شائع کی ہیں، بقیہ مذکورہ ساری کتابیں ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہوئیں پھر پاکستان سے۔

(۱۴) معارف القرآن (۱۵) علیؓ و حسینؓ (۱۶) طبقات الحجاج (۱۷) تذکرہ عُلمائے مُبارکپور

(۱۸) تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (۱۹) افادات حسن بصریؒ (۲۰) اسلامی نظامِ زندگی

(۲۱) حج کے بعد (۲۲) مسلمان (۲۳) اسلامی شادی

(۲۴) قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک (مختصر خودنوشت سوانح) یہ مذکورہ کتابیں مختلف اداروں سے شائع ہوئیں جن میں سے آخر کے چند رسالوں کے متعدّد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

عربی تصانیف

(۲۵) رجال السند والہند، یہ کتاب دو بار شائع ہو چکی ہے ایک مرتبہ بمبئی سے اور دوسری مرتبہ قاہرہ سے۔

(۲۶) العقد الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین ، یہ بھی بمبئی اور قاہرہ سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئی ہے۔

(۲۷) الھند فی عھد العباسیین

یہ خلافت عبّاسیہ اور ہندوستان کی تعریب ہے اور دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔

تحقیق و تعلیق

(۲۸) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول ابوالفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی کی اصول حدیث پر عمدہ اور بہترین کتاب ہے جو پہلی مرتبہ قاضی صاحب کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہنچی۔ اس کتاب کو بمبئی کے دو مکتبوں نے شائع کیا۔ پھر تیسری مرتبہ مکتبہ علمیہ مدینہ منوّرہ نے شائع کر کے عرب دُنیا میں بھی اسے عام کر دیا۔

(۲۹) تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین البغدادی۔ یہ کتاب بھی مخطوطہ ہی تھی جسے قاضی صاحب کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ مکتبہ شرف الدین الکتبی و اولادہ بمبئی نے طبع کیا۔

(۳۰) دیوان احمد، یہ قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین مرحوم کے عربی اشعار و قصائد کا مجموعہ ہے جسے قاضی صاحب نے مرتّب و مدوّن کر کے دیوان احمد کے نام سے شائع کیا۔

ان مستقل تصنیفی و تحقیقی کاموں کے علاوہ سیکڑوں سے زائد علمی و تحقیقی مقالات و مضامین بھی سپردِ قلم کیے جو ملک کے مؤقر اور اہم رسائل معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ برہان دہلی۔ صدق لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوتے، اگر ان مقالات کو ان کے موضوع کے اعتبار سے مرتّب کر کے شائع کیا جائے تو اس کی بہت ساری جلدیں تیّار ہو سکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی تصانیف اور خدمات پر ایک اجمالی نظر

قاضی صاحب طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان میں شبلی اسکول سے متأثر تھے۔ علّامہ شبلی اور ان کے مخصوص تلامذہ کی طرح قاضی صاحب کی علمی و تاریخی تحریروں میں بھی ادب کی چاشنی رچی بسی ہے۔ اس کے ساتھ ان میں بیان کی قوّت، سلاست و فصاحت اور علمی وقار پایا جاتا ہے۔ غیر علمی اور مبتذل الفاظ ان کے یہاں تلاش کرنے سے بھی شاید نہ ملیں۔ مآخذ مصادر کے سلسلے میں بھی وہ قریب سے قریب تر اور قدیم مآخذ پر بالعموم اعتماد کرتے ہیں اور نقل و روایت میں پوری احتیاط برتتے ہیں۔ اسی بنا پر علمی دنیا میں ان کے حوالوں پر مکمّل طور پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مدارس اور یُونیورسٹیوں دونوں حلقوں میں یکساں مقبول ہیں اور جس طرح عُلماء و فضلاء ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، جدید علوم وفنون کے ماہرین بھی اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں ان سے مدد لیتے اور حوالہ کے طور پر اُنہیں استعمال کرتے ہیں۔

علمائے ہند میں قاضی صاحب کو یہ شرف و مجد حاصل ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ و ثقافت اور یہاں کے طبقات و رجال پر جس وسیع پیمانے پر اُنھوں نے کام کیا ہے۔ مولانا سیّد عبدالحیّ حسنی صاحب نزہۃ الخواطر کے علاوہ اس باب میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، ان کی کتابوں سے اشخاص و رجال کے تراجم علٰحدہ کرکے مرتّب کیے جائیں تو ان کی متعدّد ضخیم جلدیں تیّار ہوسکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی عمر سنہ ہجری کے اعتبار سے بیاسی سال سے متجاوز تھی، لیکن ان علمی و قلمی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کی عام صحّت، جسمانی ساخت اور چستی و ہمّت کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے فیوض وحسنات کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا، لیکن ادھر چند مہینوں سے ان کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں جس سے تشویش تھی۔ پھر قاضی صاحب کے پوتے مولوی فرحان سلمہٗ متعلم دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند سے معلوم ہُوا کہ اب رو بہ صحّت ہیں جس سے یک گونہ اطمینان ہوگیا تھا اور یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ وہ جلد ہی چلے جائیں گے، لیکن موت ایک ایسی چیز ہے جس نے اندازوں اور تخمینوں کو ہمیشہ شکست دی ہے۔ آخرکار معمولی سی علالت کے بعد وہ اچانک اس دار فانی سے رُخصت ہوگئے اور ایک دن سب کو ہی یہاں سے کوچ کرنا ہے، مگر یہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے پیچھے اپنا شاندار کام چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی تو بلاشُبہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

بقیہ: درسِ حدیث

اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ وَاَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ۔

بہترین دُعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب و سُنّت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قسط:۱۳

مضامینِ علمیہ

تحفۂ اصلاحی

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب فاضل و مدرس جامعہ مدینہ

○

امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر "تدبّر القرآن" کے علاوہ اُصولِ تفسیر میں "مبادی تدبّر قرآن" اور اُصولِ حدیث میں "مبادی تدبّرِ حدیث" بھی لکھے ہیں۔ اصلاحی صاحب کے مبادی اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ع

ہُوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اپنے سلسلہ مبادی میں اُنہوں نے جو گل افشانیاں کی ہیں وہ مدلّل ابطال اور احقاق حق کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہیں۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنائے آمین

باقی جو لوگ سات کو کثرت کے مفہوم میں لیتے ہیں ان کے قول سے بھی سات قراءتوں کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا اور توثیق و تاکید ہوتی ہے۔ اس قول کے قائل قاضی عیاض اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ ہیں — شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

و دلیل بر آنکہ ذکر سبعہ بجہت تکثیر است نہ برائے تحدید اتّفاق ائمہ است بر قراءات عشرہ و ہر قراءت را ازیں عشرہ دو راوی ست و ہر یکے با دیگرے مختلف ست پس مرتقی شُد عدد قراءۃ تا بیست (مصفّٰی)

اور اس بات کی دلیل کہ سات کا عدد حدیث میں تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تحدید کے لیے دس قراءتوں پہ ائمہ کا اتّفاق ہے اور ان دس قراءتوں میں سے ہر ایک کے دو راوی ہیں اور ہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں پس قراءات کی تعداد بیس تک پہنچ گئی ہے۔

بات یہ ہے کہ حروف سبعہ والی حدیث بھی تواتر سے ثابت ہے اور موجودہ دس قراءات (یا بالفاظ

دیگر بیس روایتیں) بھی تواتر سے ثابت ہیں۔ ان کے ثبوت میں اصل حجت و دلیل تواتر ہے، البتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف قراءات کا تعلّق حروف سبعہ سے ہے۔ علمائے اُمّت نے اپنے اپنے علم و اجتہاد سے حروف سبعہ کی تشریح کر کے اس تعلّق کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ قراءات عشرہ اور سبعہ حروف والی حدیث دونوں کا تواتر سے علیحدہ علیحدہ ثبوت ہے۔ لہٰذا کسی کے حروف سبعہ کی غلط تشریح کرنے سے قراءت کا ثبوت اثر انداز نہیں ہوتا۔

امین احسن اصلاحی صاحب نے حروف سبعہ سے متعلّق اپنی رائے یہ لکھی ہے۔

"غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرآتوں کا اختلاف دراصل قرآتوں کا اختلاف نہیں بلکہ اکثر و بیشتر تاویل کا اختلاف ہے۔ کسی صاحب تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قرأت کا اختلاف سمجھ لیا گیا، حالانکہ وہ قرآتوں کا اختلاف نہیں، بلکہ تاویل کا اختلاف ہے ..."

یہ رائے انتہائی غلط ہے اور درحقیقت اس کا مبنیٰ قراءت عشرہ متواترہ کا انکار ہے اوائل میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کتابتِ حدیث سے بھی اسی لیے منع کیا تھا کہ قرآن کے ساتھ غیر قرآن کا خلط نہ ہو جائے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی بے توجہی اور بے احتیاطی کی ہو کہ تاویل کو قرأت سمجھا جانے لگا ہو پھر یہ ایسی زبردست غلطی ہو کہ اُمّت تواتر کے ساتھ اس کی مرتکب چلی آ رہی ہے۔ اس پر تو بڑا اعتراض یہ پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو ذمّہ لیا ہے وہ غیر مؤثر ہو گیا۔ اور قرآن کی قرآنیت باقی نہ رہی۔

مزید بریں قراءات کا اختلاف صرف اسی میں منحصر تو نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں سات قسم کے اختلافات ہیں۔ لہجوں کا اختلاف۔ افراد تثنیہ جمع اور تذکیر و تانیث کا اختلاف۔ افعال میں ماضی و مضارع کا اختلاف۔ وجوہ اعراب کا اختلاف تقدیم و تاخیر کا اختلاف اور الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف وغیرہ۔ اصلاحی صاحب آخر ان سب اختلافات کو تاویل کے اختلاف میں کیسے سمیٹیں گے

سبعۃ احرف کی تشریح کے بارے میں ایک اور قول ایسا ملتا ہے جس سے شاید کسی کو اصلاحی صاحب کی رائے کے اس سے ماخوذ ہونے کا شبہہ ہو، لیکن ان دونوں رایوں میں بڑا فرق ہے جو اس قول کو سمجھنے

سے معلوم ہو سکتا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہُوا تھا، لیکن چونکہ اہلِ رب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک کے لیے اس ایک لغت پر قرآن ریم کی تلاوت بہت دُشوار تھی۔ اس لیے ابتدائے اسلام میں یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ اپنی لاقائی زبان کے مطابق مرادف الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ جن لوگوں کے لیے آن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی ان کے لیے خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے ادفات متعیّن فرما دیے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں۔ یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں لغات سے منتخب کیے گئے تھے اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تعال کی جگہ هَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ یا جاتے۔ معنی سب کے ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دَور میں تھی یکہ تمام اہلِ عرب قرآنی زبان کے پُورے طور پر عادی نہیں ہُوتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا ئرہ اثر بڑھتا گیا۔ اہلِ عرب اس کے عادی ہو گئے اور اُن کے لیے اسی اصلی لغت پر قرآن کی تلاوت سان ہو گئی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا جسے عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر یہ مرادفات سے پڑھنے کی جازت ختم کر دی گئی اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہُوا تھا۔

(مشکل الآثار للطحاوی، ج: ۴)

اس قول کے مطابق سبعۃ احرف والی حدیث اسی زمانے سے متعلّق ہے۔ جب تلاوت میں مرادفات ستعمال کرنے کی اجازت تھی اور اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہُوا ہے بلکہ مطلب تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہُوا ہے کہ اسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر پڑھا سکے گا اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کیے جا سکتے ہیں ان کی تعداد سات ہے۔ اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کر لے، بلکہ متبادل اظ کی تعیین بھی خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرما دی تھی اور ہر شخص کو آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح سکھلایا تھا جو اس کے لیے آسان ہو۔ لہٰذا صرف ان مرادفات کی اجازت دی گئی جو حضور صلّی اللہ علیہ

وسلم سے ثابت تھے۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۲-۲۳)

یہ قول امام طحاوی کے علاوہ سفیان بن عیینہ، ابن وہب اور حافظ ابن عبدالبر رحمہم اللہ کا بھی ہے ان کی دلیل یہ حدیث ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ان جبریل قال یا محمد اقرأ القرآن علی حرف قال میکائیل استزده حتی بلغ سبعة احرف قال کل شاف کاف مالم تخلط آیة عذاب برحمة او رحمة بعذاب نحو قولك تعال و اقبل و هلم و اذهب و اسرع وعجل۔

جبرئیل علیہ السلام نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا کہ اے محمد قرآن کو ایک حرف پر پڑھیے۔ میکائیل علیہ السلام نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا۔ اس میں اضافہ کروائیے۔ یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے تاوقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کریں یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ کا قول تعال اقبل ھلم اذھب اسرع اور عجل۔

اس قول سے یہ نتیجہ نکالنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ان مرادفات ہی پہ اختلاف واقع ہُوا ہوگا۔ کیونکہ ہم یہ بات پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ سبعۃ احرف کی حدیث جس طرح تواتر سے ہم تک پہنچی ہے۔ اسی طرح تواتر سے ہم تک دس قراءات بھی پہنچی ہیں۔ سبعۃ احرف سے کیا مراد ہے اور اُن کا موجودہ قراءات سے کیا تعلق ہے۔ اس پر علماء نے اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے اور اسی بناء پر اس بارے میں چالیس سے زائد قول وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کی مراد متشابہ ہے۔ سبعۃ احرف کے مفہوم کے مجتہد فیہ ہونے سے قراءات عشرہ کے تواتر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پچھلے مباحث کے ساتھ اگر ہم اس قول کو ملا لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ پچھلے قراءتوں کے درمیان جو سات قسم کے اختلافات ذکر کیے گئے ہیں، ان سات اقسام میں سے ایک قسم بدلیتِ مرادفہ کا اختلاف ہے۔ مذکورہ بالا روایت میں حضرت ابو بکرؓ نے سات حروف کی مکمل تشریح نہیں فرمائی بلکہ

اس کی صرف ایک مثال دی ہے اس لیے اختلاف کی صرف ایک قسم یعنی اختلافِ الفاظ بدلیت کا ذکر فرمایا۔

حاصل یہ ہوا کہ اختلافِ قرارات کی یہ قسم یعنی اختلاف الفاظ ابتدائے اسلام میں بہت زیادہ تھی چونکہ تمام اہلِ عرب لغتِ قریش کے پوری طرح عادی نہ تھے اس لیے شروع میں انہیں یہ سہولت زیادہ سے زیادہ دی گئی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے متبادل الفاظ میں سے جس لفظ کے ساتھ چاہیں تلاوت کرلیا کریں، چنانچہ شروع میں ایسا بکثرت تھا کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہو اور دوسری قرأت میں اس کا ہم معنی دوسرا لفظ، لیکن جب لوگ لغت قرآن سے پوری طرح مانوس ہوگئے تو اختلافِ قرأت کی یہ قسم رفتہ رفتہ کم کردی گئی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے قرآن کریم کا دو مرتبہ دور فرمایا۔ اس وقت بہت سے الفاظ منسوخ کردیے گئے اور اس طرح الفاظِ مرادفہ کا اختلاف بہت کم رہ گیا۔

عرضہ اخیرہ کے وقت متعدد قرأتیں منسوخ ہوگئی تھیں اس کی دلیل محقق ابن جزری رحمہ اللہ کا یہ قول ہے۔

" ولا شك ان القرآن نسخ منه وغير فيه فى العرضة الاخيرة فقد صح النص بذلك عن غير واحد من الصحابة وروينا باسناد صحيح عن زر بن حبيش قال قال لى ابن عباس اى القرأتين تقرأ قلت الاخيرة قال فان النبى صلى الله عليه وسلم كان يعرض القران على جبرئيل عليه السلام فى كل عام مرة قال فعرض عليه القرآن فى العام الذى قبض فيه النبى صلى الله عليه وسلم مرتين فشهد

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرضہ اخیرہ کے موقع پر قرآن کریم میں بہت کچھ منسوخ کیا گیا اور اس میں تغییر کی گئی کیونکہ اس کی تصریح متعدد صحابہ سے منقول ہے ہم تک صحیح سند کے ساتھ زر بن حبیش کا یہ قول پہنچا ہے کہ مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا تم کون سی قرأت پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ آخری قرأت انھوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے پس جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا۔ اس موقع پر جو کچھ

عبد اللہ یعنی ابن مسعود ما نسخ منه وما بدل (النشر فی القرأت العشر ص۳۲ ج۱)

منسوخ ہوا اور جس قدر تبدیلی کی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے شاہد تھے۔

ہماری ان تمام وضاحتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ امین احسن اصلاحی صاحب پوری اُمّت[1] کے برعکس قراءتِ عشرہ کے متواتر ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اسی انکار کو بنیاد بنا کر انھوں نے مغالطوں کی ایک عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ تاریخ کو بھی مسخ کرنے سے باز نہیں آئے۔

بقیہ: رحمۃ للعالمین

خلاصہ اور نتائج

گزشتہ تمام بحث سے بنیادی مطالبات کی تشریح کرنی تھی۔ خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ خالق کی معرفت
۲۔ انسانی شرافت کا مقصود
۳۔ کیوں پیدا ہوا، کیا کرنا ہے، کیا جانتا ہے۔
۴۔ پیٹ
۵۔ تحفّظِ مال
۶۔ تحفّظِ صنعت
۷۔ تحفّظ و ترقّی تجارت
۸۔ تحفّظِ جان
۹۔ تحفّظِ نسل
۱۰۔ تحفّظِ عصمت و ناموس
۱۱۔ عدل و انصاف
۱۲۔ تمدّن و تہذیب
۱۳۔ حقوقِ ملکیت میں آزادی
۱۴۔ حقوقِ انسانیت میں مساوات

---

[1] علّامہ شوکانی اور نواب صدّیق حسن خان نے بھی قراءتِ عشرہ کے تواتر کا انکار کیا ہے، لیکن بارہ صدیوں بعد اجماع سے اُن کے انحراف سے اجماعِ اُمّت پر کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔ منہ

(قسط: ۲ آخری)

علاقائی حقوق سے متعلّق احکام

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدُالواحِد زید مجدہم
مُدرّس و نائب مُفتی و فاضِل جامعہ مدنیہ

چند سال پیشتر سندھ سے ایک صاحب نے علاقائی حقوق سے متعلّق ایک سوالنامہ بھیجا تھا۔ وہ سوالنامہ تو اتّفاق سے گم ہوگیا، البتّہ اس کا جو جواب لکھا گیا تھا وہ مکمّل موجود ہے۔ جواب ترتیب کی کچھ ترمیم اور کچھ حک و اضافہ کے ساتھ استفادہ عام کے لیے پیش ہے۔

علاقائی حقوق سے متعلّق بحث وقتاً فوقتاً اُٹھائی جاتی رہتی ہے اور افسوس ہے کہ بعض اہلِ علم بھی اس کی سحرکاری کا شکار ہوئے۔ یہ موضوع تو خاصا وسیع ہے، لیکن جو اُصولی باتیں تحریر میں آئی ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو ہم سب کے لیے نافع بنادیں۔

البتّہ یہ بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ دینِ اسلام کے کسی ایک شعبہ کو ہم کسی ایسے نظام میں FIT کرکے دیکھنے کی کوشش کریں گے جو کہ سراسر غیر اسلامی بلکہ ظالمانہ ہو تو ہمیں اس شعبہ سے متعلّق بہت سے اشکالات پیش آئیں گے۔ اگر ہم ایک خاک آلود مٹی کی دیوار میں ایک صاف شفاف ٹائل لگائیں گے تو اس ٹائل کا حُسن خاک میں چھپ جائے گا لہٰذا ظالمانہ اور غیر اسلامی پس منظر میں اس شعبہ کو نہ دیکھیں بلکہ منصفانہ اور اسلامی مجموعی نظام کے پس منظر میں اس شعبہ کو دیکھیں تو انشاء اللہ کوئی اشکال پیش نہ آئے گا۔ فقط

کوٹری بیراج کی پانچ لاکھ ایکڑ اراضی نیلام کرنے کی تجویز اور فوجیوں کو الاٹمنٹ کے مسئلے پر ممتاز صحافی سید

سردار علی شاہ نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ کوٹری بیراج کی زمین کی تقسیم کے سلسلے میں مزید جو اطلاعات آئی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے ریونیو بورڈ نے بیراج کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین نیلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں مغربی پاکستان حکومت سے اس قسم کی باز پرس کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا کہ اس نے کیوں کر اپنی پالیسی عوامی تقاضوں اور انصاف کے برعکس مرتّب کی ہے۔ کوٹری بیراج کی تعمیر کا پہلا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی اراضی سندھ کے ہاریوں اور بے زمین کاشتکاروں کو مہیّا کی جائے اس لیے سندھ کے لوگوں پہ بھاری محصول اور ٹیکس عائد کر کے اور دوسرے ترقیاتی کام روک کر بیراج کے لیے لاکھوں روپے جمع کیے گئے۔ لوگوں نے اس بوجھ کو اس لیے برداشت کیا کہ اُنھیں یقین تھا کہ جب بیراج تکمیل پا جائے گا تو اس سے سندھ کے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔

محمود حسن خان لکھتے ہیں۔

More, significantly, as new irrigation and battlement schemes in the Punjab and Sind were undertaken in the mid-fifties civil and military bureaucracies were clearly given preferential treatment for irrigated lands. In fact, sale and allotment of these lands in Sind to these outsiders were quite contrary to the promises made by some politicians for peasant grants to haris and allotment to small owners.

ترجمہ: خاص طور سے جب پچاس کی دہائی کے وسط میں پنجاب اور سندھ میں آبپاشی اور آبادکاری کی نئی سکیمیں روبعمل لائی گئیں تو نہری اراضی میں سول اور فوجی نوکر شاہی کے ساتھ واضح ترجیحی سلوک کیا گیا۔ درحقیقت سندھ میں باہر والوں کے ہاتھ ان زمینوں کی فروخت اور الاٹمنٹ بعض سیاستدانوں کے ان وعدوں کے بالکل مخالف تھی کہ ہاریوں کو گرانٹ دی جائیگی اور چھوٹے مالکان اراضی کو الاٹمنٹ کی جائے گی۔

ستم ظریفی دیکھیے سندھ کے ساتھ یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہوا تھا، بلکہ قیام پاکستان سے پیشتر سکھر بیراج کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ محمود حسن صاحب لکھتے ہیں۔

Among the most important changes in the agriculture of Sind

was the completion of Llyod Barrage (now called Sukkut Barrage) on the Indus in 1932. In this Zamindar and hari alike saw the hope of acquiring irrigated lands. In several areas, Zamindars successfully claimed their forfited lands after they began to receive water. This they were allowed under a law by the British in 1932, when Sind was still a part of Bombay presidency. The haris were promised harp, peasant grants on newly irrigated state lands. However, state lands in flood Barrage area, estimated at over one million acres, were sold to settles mainly from outside Sind. Consequently, haris received as harp grants of no more, than 85,000 acres from 1932 to about the time of Independence in 1947. Since reach hari family received 16 to 24 acres, the total number of beneficences could not have been more than 5,500. there is also evidence that these was great reluctance on the part of revenue officials to enter into Records of Rights the titles of lands haris received from the state.

ترجمہ : سندھ کی زراعت میں سب سے اہم تبدیلیوں میں سے ایک سکھر بیراج کی تکمیل تھی جو کہ دریائے سندھ میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ اس وقت زمینداروں اور ہاریوں دونوں کو نہری زمین حاصل کرنے کی یکساں اُمید تھی۔ بعض علاقوں میں پانی حاصل ہونے کے بعد زمینداروں نے کامیابی اپنی مقبوضہ زمینوں کے کلیم حاصل کیے۔ یہ ان کے لیے ۱۹۳۲ء میں ایک برطانوی قانون کے تحت ممکن ہُوا جس وقت کہ سندھ بمبئی پریذیڈنسی کا ایک حصّہ تھا۔ ہاریوں سے ہارپ یعنی نئی نہری زمینوں میں سے گرانٹ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن سکھر بیراج کی سرکاری زمینیں جو کہ دس لاکھ ایکڑ سے زیادہ تھیں زیادہ تر ان آباد کاروں کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں جو غیر سندھی تھے۔ نتیجتاً ہاریوں کو ۱۹۳۲ء تک بطور ہارپ گرانٹ کے پچاسی ہزار ایکڑ سے

زیادہ نہ ملیں۔ چونکہ ہر ہاری خاندان کو سولہ سے چوبیس ایکڑ تک زمین ملی، لہٰذا فائدہ اُٹھانے والے ہاریوں کی کل تعداد ساڑھے پانچ ہزار سے زائد نہ ہوگی۔ اس بات کا بھی ثبوت موجود ہے کہ ریونیو افسران کی جانب سے اس بارے میں بڑی عدم آمادگی تھی کہ رجسٹروں میں ان زمینوں کا اندراج کیا جائے جو ہاریوں نے حکومت سے حاصل کیں۔

۱۹۵۹ء کی اصلاحاتِ اراضی کے تحت جو اراضی حاصل ہُوئیں ان میں سے کتنا حصّہ فروخت کیا گیا؟ اس کے بارے میں محمود حسن خاں جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بے زمین کاشتکاروں کے ساتھ یہاں بھی فراخدلی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔

How much of the resumed land was sold? And to whom? ...only 50% of the resumed land (or 952,000 acres) had been sold by 1967. Since most of the resumed areas in the Punjab was uncultivated, only 36% of the resumed land (469,623 acres) had been disposed of. In Sind, on the other hand about 71% of the resumed land (or 374,152 acres) had been disposed of although resumed area in the PUnjab was about one-third more than in Sind. Most of the area was sold to landless tenants and small owners/tenants. 65% in the Punjab and 75% in Sind. However, only 40% of total area was sold to landless tenants in the two provinces. The remaining area, which was by no means insubstantial, was auctioned, in which land was sold mostly to rich farmers and to civil and military officials. In fact, during government lands in the newly irrigated areas to these groups.

ترجمہ: بازیاب کی گئی اراضی میں سے کتنی فروخت کی گئی اور کس کو فروخت کی گئی؟ ۱۹۶۷ء تک اس کا پچاس فیصد فروخت کیا گیا تھا چونکہ پنجاب میں بازیاب شُدہ اراضی کا بیشتر رقبہ غیر مزروعہ تھا لہٰذا بازیاب شدہ اراضی کا صرف ۳۶ فیصد ہی نمٹایا گیا تھا اس کے برعکس سندھ میں بازیاب

شدہ اراضی کا تقریباً ۷۱ فیصد حصہ نمٹایا جاچکا تھا، حالانکہ پنجاب کا بازیاب شدہ رقبہ سندھ کے مقابلے میں تقریباً ایک تہائی زیادہ تھا۔ بہت سا رقبہ بے زمین کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کیا گیا یعنی پنجاب میں ۶۵ فیصد اور سندھ میں ۷۵ فیصد لیکن کل ملاکر جو رقبہ بے زمین کاشتکاروں کے ہاتھ دونوں صوبوں میں فروخت کیا گیا وہ صرف ۴۰ فیصد تھا۔ باقی کا رقبہ جو کہ کسی اعتبار سے بھی کم نہ تھا۔ نیلام کیا گیا جس میں زیادہ تر اراضی امیر جاگیرداروں اور سول اور فوجی افسران نے خرید کی۔ درحقیقت ساٹھ کی دہائی میں نئے سیراب شدہ علاقوں میں انتقالِ اراضی کے لیے نیلامی کے ذریعے فروختگی ایک اہم پالیسی تھی۔

دوسری صورت

علاقے والوں کی رضامندی سے وہاں زمینوں اور ملازمتوں کی مستقل تحصیل کی ہو۔ یہ لوگ مقامی لوگوں جیسے حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔

تیسری صورت کا حکم

پہلے چند اُصولی باتیں سمجھ لیں۔

پہلا اُصول :

غیر علاقے کے لوگوں کو زمینیں دی جاسکتی ہیں۔

(الف) عن اسماء بنت ابی بکر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اقطع الزبير ارضا بخيبر فيها شجر و نخل (كتاب الاموال ۶۷۸ ص۲۵۳)

اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے زبیر کو خیبر میں کھجور اور دیگر پھلوں کے درختوں والی زمین بطور جاگیر عطا کی۔

(ب) عن عمرو بن دينار قال لما قدم النبی صلى الله عليه وسلم المدينة اقطع ابابكر و اقطع عمر رضی الله عنهما۔ (الخراج لابی یوسف ص۶۷)

عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ جب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم مدینہ تشریف لائے تو ابوبکر اور عمر کو جاگیریں عطا فرمائیں۔

(ج) عن ابی رافع قال اعطاهم النبی صلى الله عليه وسلم ارضا فعجزوا عن عمارتها فباعوها فی زمن عمر بن الخطاب بثمانية آلاف دينار أو بثمانمائة الف درهم۔ (الخراج لابی یوسف ص۶۷)

ابو رافع کہتے ہیں کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے لوگوں کو جاگیر عطا کی۔ وہ اس کی آباد کاری نہ کر سکے، لہٰذا اُنھوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کو آٹھ ہزار دینار یا آٹھ ہزار درہم پر فروخت کر دیا۔

(د) عن موسی بن طلحة قال اقطع عثمان بن عفان لعبد الله بن مسعود رضی الله عنهما فی النهرین ولعمار بن یاسر استینیا (قریة بالکوفة)

واقطع خبابا صنعاء وأقطع سعد بن مالك قریة هرمزان قال فكل جار (الخراج لابی یوسف ص۶۷)

موسی بن طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نہرین میں اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو استینیا میں اور خباب رضی اللہ عنہ کو صنعاء میں اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کو ہرمزان میں جاگیریں عطا فرمائیں۔

(ہ) یہ اُصول مسلم ہے کہ جو علاقے قُوّت سے فتح کیے گئے ہوں اگر حاکم مناسب سمجھے تو اُن کو غانمین میں تقسیم کر دے جیسا کہ خیبر میں ہُوا۔

(و) حدیث میں ہے۔ من احیا ارضاً مواتاً له ولیس لعرق ظالم حق (الخراج لابی یوسف)

جس شخص نے کوئی بنجر زمین آباد کی تو وہ اس کی ملکیت ہے اور کسی ظالم کو اس کے لینے کا حق نہیں ہے۔

اور کلمہ مَنْ عموم کے لیے ہوتا ہے۔ (لان کلمة من للعموم۔ نور الانوار)

فقہی عبارتوں میں بھی عموم پایا جاتا ہے۔ وکل من احیا ارضا مواتا فهی لهٗ (الخراج لابی یوسف ص۶۹)

وقد کان ابو حنیفة رحمه الله یقول من احیا ارضا مواتا فهی له اذا اجازه الامام (الخراج ص۶۹) ولك ان تقطع ذلك من احببت ورایت تواجره تعمل فیه بما تری انه صلاح

ہر وہ شخص جو کسی بنجر زمین کو آباد کرے تو وہ زمین اس کی ملکیّت ہے اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے تھے جس شخص نے کوئی بنجر زمین آباد کی تو وہ اس کی ملکیّت ہے جبکہ حاکم اجازت دے دے۔ اور آپ کو اختیار حاصل ہے کہ آپ جس کو چاہیں اور مناسب سمجھیں جاگیر دیں اور جس کے ساتھ چاہیں فائدہ مند اُجرت کا معاملہ فرمائیں۔

اور جب قطائع وغیرہ دیے جا سکتے ہیں کہ جن میں ایک صُورت یہ ہے کہ زمین کا مالک بنا دیا جائے جیسا کہ ابو رافع کی روایت سے معلوم ہوتا ہے تو غیر علاقے کے لوگوں کے ہاتھ زمینوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کا مآل ایک ہے یعنی تملیک

کتاب الخراج میں امام ابو یُوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

وكل من اقطعه الولاة المهديون أرضا من ارض السواد وارض العرب والجبال من الاصناف التي ذكرنا ان للامام ان يقطع منها فلا يحل لمن يأتي بعدهم من الخلفاء ان يرد ذلك ولا يخرجه من يدي من هو في يده وارثا أو مشتريا فأما ان اخذ الوالي من يد واحد أرضا واقطعها آخر فهذا بمنزلة الغاصب غصب واجدًا واعطى آخر فلا يحل للامام ولا يسعه ان يقطع أحدا من الناس حق مسلم ولا معاهدٍ ولا يخرج من يده من ذلك شيئا الا بحق يجب له عليه فياخذه بذلك الذي وجب له عليه فيقطعه من احب من الناس فذلك جائز له ۔ والارض عندي بمنزلة المال فللامام ان يجيز من بيت المال من كان له غناء في الاسلام ومن يقوى به على العدو و يعمل في ذلك بالذي يرى انه خير للمسلمين و اصلح لا مرهم (ص۶۶)

ہدایت یافتہ حکمرانوں نے ارض عراق، ارض عرب اور پہاڑی علاقوں میں سے کسی کو جاگیروں کی وہ قسم عطا کی جو جائز ہیں تو بعد میں آنے والے حکمرانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان کو واپس لیں اور ان لوگوں کے قبضہ میں سے نکالیں جن کے پاس وہ اب وراثت یا خریداری کے ذریعے سے آئی ہیں اور اگر حاکم نے ایسے کسی قابض سے لے کر کسی دوسرے کو دی تو وہ بمنزلہ غاصب کے ہوگا جس نے ایک سے چھین کر دوسرے کو دیا۔ لہٰذا حاکم کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان یا ذمی کا حق چھین کر کسی دوسرے کو دے اور قابض سے کچھ نہیں لے سکتا مگر فقط وہ حق جو حاکم کا قابض پر واجب ہو۔ اس وقت حاکم وہ حق لے کر کسی دوسرے کو دے سکتا ہے اور زمین میرے نزدیک مال کی مثل ہے۔ لہٰذا امام کو اختیار ہے کہ وہ بیت المال میں سے مسلمان غنی کو عطا کرے اور اس شخص کو عطا کرے جو اس مال سے دشمن کے مقابلے میں قوت و غلبہ پائے اور حاکم بیت المال میں وہ تمام تصرفات کر سکتا ہے جن میں مسلمانوں کے لیے بھلائی اور زیادہ نفع ہو۔

دوسرا اُصول

البتہ یہ قطائع وغیرہ معلول بالصلاح تھے۔ یعنی یہ جاگیریں اس وقت دی جا سکتی ہیں جب اس میں مسلمانوں کا زیادہ فائدہ ہو۔

قال ابو یوسف: فقد جاءت هذه الآثار بان النّبی صلّی الله علیه وسلّم اقطع اقواما وأن الخلفاء من بعده أقطعوا و رأی رسول الله صلّی الله علیه وسلّم الصلاح فیما فعل من ذلك اذ کان فیه تالف علی الاسلام وعمارة للارض۔ (ص۶۸)

قاضی ابو یُوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ روایات وارد ہُوئی ہیں کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کچھ لوگوں کو جاگیریں دیں اور آپ کے بعد خلفاء نے جاگیریں دیں اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس بارے میں جو کچھ کیا اس میں آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مصلحت دیکھی کیونکہ اس میں ایک فائدہ لوگوں کا اسلام پر جماؤ تھا اور دوسرا زمین کی آباد کاری تھی۔

وایما ارض افتتحها الامام عنوةً فقسمها بین الذین افتتحوها فان رأی ان ذلك افضل فهو فی سعة من ذلك و هی ارض عشر و ان لم یر قسمتها و ان رای الصلاح فی اقرارها فی ایدی اهلها کما فعل عمر بن الخطاب رضی الله عنه فی السواد فله ذلك (ص۶۹)

اور مسلمان حاکم جو بھی علاقہ قوّت سے فتح کرے اور یہ خیال کرے کہ مفتوحہ علاقے غانمین میں تقسیم کرنے ہی میں مصلحت ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور یہ زمین عشری ہوگی اور اگر وہ اس میں مصلحت دیکھے کہ وہ علاقہ غانمین میں تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ اس علاقے کے باشندوں کو اراضی پر برقرار رکھا جائے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق میں کیا تو ایسا بھی کر سکتا ہے

نیز کتاب الاموال میں ہے

عن ابن عون قال اقطع ابو بکر طلحة بن عبید الله ارضا وکتب له بها کتابا واشهد له ناسا فیهم عمر قال فاتی طلحة عمر بالکتاب! فقال اختم علی هذا فقال لا اختم أهذا کله لك دون الناس قال فرجع طلحة مغضبا الی ابی بکر فقال والله ما ادری انت الخلیفة ام عمر فقال بل عمر ولکنه ابیٰ

ابن عون کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے طلحہ بن عبید اللہ کو ایک جاگیر عطا کی اور اس کی تحریر لکھ دی اور حضرت عمر سمیت چند لوگوں کو گواہ بنانے کو کہا۔ طلحہ حضرت عمر کے پاس آئے اور کہا کہ اس پر اپنی مہر لگا دیجیے۔ حضرت عمر نے جواب دیا میں مہر نہیں لگاؤں گا کیا اور لوگوں کو چھوڑ کر یہ تنہا تمہارے لیے ہو اس جواب پر طلحہ غصّہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور

کہا کہ واللہ میں نہیں جانتا خلیفہ آپ ہیں یا عمر ہیں۔
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا بلکہ عمر ہیں لیکن انھوں نے خلیفہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔

عن عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ان ابابکر قطع لعیینة بن حصن قطیعة و کتب له بها کتابا فقال له طلحة او غیره انا نری هذا الرجل سیکون من هذا الامر بسبیل - یعنی عمر - فلو اقرانه کتابك فاتی عیینة عمر فاقرأه کتابه۔ ثم ذکر مثل حدیث ابن عون و زاد فیه انه بَصَقَ فی الکتاب ومحاه قال فسال عیینة ابابکر ان یجددله کتابا فقال واللہ لا اجدد شیئًا رده عمر

عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عیینہ بن حصن کے لیے ایک جاگیر لکھ دی۔ عیینہ کو طلحہ یا کسی اور نے کہا کہ ہمارا خیال ہے آئندہ عمر خلیفہ ہوں گے۔ لہٰذا اگر تم یہ ان کو بھی پڑھوا لو تو اچھا ہوگا۔ عیینہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اُن کو وہ حکم نامہ پڑھایا۔ باقی قصہ ابن عون کی روایت کی مثل ہے۔ البتہ اس میں اتنا مضمون زائد ہے کہ حضرت عمرؓ اپنا لعاب اس تحریر پر لگایا اور تحریر کو مٹا دیا۔ بعد میں عیینہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تحریر دوبارہ لکھنے کی درخواست کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ میں اس چیز کی تجدید نہیں کروں گا جس کو عمر نے مسترد کر دیا ہے۔

عن محمّد بن عبید اللہ الثقفی قال خرج رجل من اهل البصرة من ثقیف یقال له نافع ابو عبید اللہ . . . . . فقال لعمر بن الخطاب ان قبلنا ارضا بالبصرة لیست من ارض الخراج ولا تضر باحد من المسلمین فان رایت ان تقطعنیها اتخذ فیها قضبا لخیلی فافعل قال فکتب عمر الی ابی موسیٰ الاشعری ان کانت کما یقول فاقطعها ایاه

محمّد بن عبید اللہ ثقفی سے روایت ہے کہ بصرہ کا رہنے والا ایک ثقفی شخص جن کا نام نافع ابوعبداللہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ ہماری طرف بصرہ میں کچھ ایسی زمین ہے جو خراجی نہیں ہے اور جس سے کسی مسلمان کا ضرر نہیں ہے۔ اگر آپ خیال فرمائیں تو وہ زمین مجھے عطا کر دیجیے تاکہ میں اس میں اپنے گھوڑوں کے لیے چارہ اگاؤں۔ حضرت عمرؓ

نے ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسے یہ بیان کرتے ہیں تو وہ زمین ان کو بطور جاگیر دے دو۔

عن قیس بن ابی حازم قال کانت بجیلة ربع الناس یوم القادسیة فجعل لهم عمر ربع السواد فاخذوه سنتین أو ثلاثا فوفد عمار بن یاسر الی عمر معه جریر بن عبد الله فقال عمر لجریر یا جریر ولولا انی قاسم مسئول لکنتم علی ما جعل لکم ورأی الناس قد کثروا فاری ان ترده علیهم ففعل جریر ذلك فاجازه عمر بثمانین دینارا (کتاب الاموال ص۱۵۴ ص۶۳)

قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ جنگ قادسیہ میں بجیلہ قبیلے والے چوتھائی فوج تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عراق کا چوتھائی علاقہ دے دیا جو انھوں نے دو یا تین سال رکھا۔ پھر عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ کی معیت میں حضرت عمر کے پاس گئے تو حضرت عمر نے سے فرمایا اگر میں قاسم مسئول نہ ہوتا تو جو زمینیں تم کو دی گئیں وہ تمہارے لیے برقرار رکھی جاتیں، لیکن اب لوگ زیادہ ہوگئے ہیں تو میری رائے یہ ہے کہ تم وہ زمین واپس لوٹادو حضرت جریر نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمر نے ان کو انعام میں اسی دینار دیے۔

حاصل یہ ہے کہ

۱۔ حکومت سرکاری اراضی کو علاقے والوں اور غیر علاقے والوں پر تقسیم کرسکتی ہے ـــــ یہ خواہ مفت ہو یا قیمتاً ہو۔

۲۔ زمین کی تقسیم میں ایسی صورت اختیار کرنی چاہیے کہ جس میں زمین کی آبادکاری زیادہ ہو اور لوگوں کا زیادہ نفع ہو اور کسی کو نقصان نہ ہوتا ہو۔ گویا وقت کی ضرورتوں اور رعایا کی مصلحتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالوہاب چاچڑ صاحب نے علامہ شبلی کی الفاروق سے جو مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے

"حضرت عمرؓ نے ان تمام اراضیات کو جو شاہی جاگیر تھی یا جن پر رومی افسر قابض تھے باشندگان ملک کے حوالے کردیا اور بجائے اس کے وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جاتیں قاعدہ بنایا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہوسکتے۔ یعنی مالکانِ اراضی کو

قیمت دے کر خریدنا چاہیں تو خرید بھی نہیں سکتے۔ یہ قاعدہ ایک مدّت تک جاری رہا، چنانچہ لیث بن سعد نے مصر میں کچھ زمین مول لی تھی تو بڑے بڑے پیشوایانِ مذہب مثلاً امام مالک نافع بن یزید بن لہیعہ نے ان پہ سخت اعتراض کیا۔ مقریزی ص ۲۹۵۔ حضرت عمرؓ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہلِ عرب کو جو ان ممالک میں پھیل گئے تھے۔ زراعت کی ممانعت کر دی، چنانچہ فوجی افسروں کے نام احکام بھیج دیے کہ لوگوں کے روزینے مقرّر کر دیے جائیں اس لیے کوئی زراعت کرنے نہ پائے۔ یہ حکم اس سختی سے دیا گیا کہ شریک غطفی نے مصر میں کچھ زراعت کر لی تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ میں تجھے ایسی سخت سزا دوں گا کہ اور لوگوں کو عبرت ہو۔"

نیز "علامہ یحییٰ بن آدم نے اپنی کتاب الخراج میں متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے کہ قال عمر بن الخطاب لا تشتروا من عقار اهل الذمة ولا من بلادهم شيئا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگ نہ تو ذمیوں کی کوئی زمین خریدو اور نہ ہی ان کے علاقوں میں سے کچھ خریدو) تو عبدالوہاب چاچڑ صاحب کے بیان کردہ یہ واقعات واحکامات مصلحت اور ضرورتِ وقت کے تحت تھے کیونکہ حکومت کی جانب سے ان لوگوں کے وظائف مقرّر تھے، تو ان کو بجائے اس کے کہ کھیتی باڑی کریں اپنے آپ کو جہاد وغیرہ کے لیے تیّار رکھنا ضروری تھا۔

مہاجروں کے علاوہ دیگر غیر سندھیوں کو جو اراضی اہلِ علاقہ کی مرضی کے بغیر دی گئیں ان کا حکم

بیراجی زمینیں اور اصلاحات اراضی ۱۹۵۹ء کے تحت حاصل شُدہ زمینیں سرکاری اراضی ہوئیں، اور اُوپر ہم ایسے حوالے نقل کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت یہ اراضی جس کو چاہے دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں کسی کا ضرر نقصان نہ ہوتا ہو اور اس میں ضرورت و مصلحت بھی ہو۔

مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم اراضی میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

(۱) برتقدیر صحّت۔ سندھی ہاریوں کو زمین دینے کا وعدہ کیا گیا۔

(۲) برتقدیر صحّت۔ سندھیوں پہ بھاری محصول اور ٹیکس عائد کر کے اور دوسرے ترقیاتی کام روک کر بیراج کے لیے لاکھوں روپے وصول کیے گئے۔ لوگوں نے اس بوجھ کو اس لیے برداشت کیا کہ اُنھیں یقین تھا کہ جب بیراج تکمیل پا جائے گا تو اس سے سندھ کے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

کوٹری بیراج کی تعمیر کا پہلا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی اراضی سندھ کے ہاریوں اور بے زمین کاشتکاروں کو مہیّا کی جائے۔

(۳) بے زمین ہاریوں کی معاشی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی اور وہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و بیگار میں پسے ہوئے تھے۔

(۴) سندھ والے ۱۹۳۲ء سے زمینوں کے حصول کی آس لگائے ہوئے تھے۔ بار بار کی اُمیدیں جب ٹوٹ جائیں تو مایوسی پھیلتی ہے جو بسا اوقات شدید ردِّ عمل کا باعث بنتی ہے۔

(۵) ون یونٹ اسمبلی میں بھی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی سندھ کے لوگوں کا حکومتی فیصلے پر احتجاج و ناپسندیدگی کا اظہار۔ اس سب کو نظر انداز کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔

(۶) مقامی لوگوں کی ضروریات کو نظر انداز کرنا اور دوسرے علاقے کے لوگوں کو وہاں کی زمینیں مہیا کرنا خلاف انصاف تھا۔

اب یہ بحث رہ جاتی ہے کہ جب ایک حکمران (یا موجودہ دور میں حکومت) نے اہلِ علاقہ کے مفادات کے خلاف غیر مقامی باشندوں کو جو فائدہ پہنچائے مثلاً ان کے ہاتھ زمینیں فروخت کیں اور الاٹ کیں تو اگر اس کے بعد کوئی منصف حکومت آجائے تو وہ اصلاح احوال کیونکر کر سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی منصف حکومت آجائے اور وہ اصلاح احوال پہ آمادہ ہو تو تمام حالات اور وسائل کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ جن کی حق تلفی ہوئی اُن کے لیے کسب معاش کے تبادل طریقے موجود ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو مظلوم طبقہ کو وہ فراہم کر دیے جائیں تاکہ حق تلفی کا تدارک ہو سکے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو یا دیگر وجوہ کی بناء پر غیر مقامی باشندوں کو وہاں بسائے رکھنا مصلحت و مفاد کے خلاف ہو تو ان لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر وہ زمینیں ان سے واپس بھی لی جا سکتی ہیں جیسا کہ پیچھے گزرا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر کہ اب آبادی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا میں اس میں مصلحت سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کو جو زمین سوادِ عراق میں دی گئی تھی وہ واپس کر دو، اور اُنھوں نے واپس کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بطور انعام اسّی دینار دیے۔

علاوہ ازیں یہ فقہی قاعدہ ہے کہ تصرف امام علی الرعیۃ منوط بالمصلحۃ۔ یعنی رعایا پہ حاکم کے تصرف کا دارومدار مصلحت پہ ہوتا ہے (قاعدہ خامسہ من الاشباہ والنظائر)۔ اشباہ میں اس قاعدے کے تحت فرمایا۔

(تنبیہ) اذا کان فعل الامام مبنیا علی المصلحۃ فیما یتعلق بالامور العامۃ

لم ینفذ امره شرعا الا اذا وافقه فان خالفه لم ینفذ ولهذا قال الامام ابو یوسف رحمه الله فی کتاب الخراج من باب احیاء الموات ولیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف انتهی وقال قاضیخان فی فتاواه من کتاب الوقف ولو ان سلطانا اذن لقوم ان یجعلوا ارضا من اراضی البلدة انیت موقوفة علی المسجد لو امرهم ان یزیدوا فی مسجدهم قالوا ان کانت البلدة فتحت عنوة وذلك لایضر بالمار والناس ینفذ امر السلطان فیها و ان کانت البلدة فتحت صلحا تبقی علی ملك ملاکها فلا ینفذ امر السلطان فیها

جبکہ رعایا سے متعلق اُمور میں حاکم کا فعل مصلحت پر مبنی ہونا ضروری ہے تو اگر اس کا کوئی حکم مصلحت کے موافق ہوگا تب تو نافذ ہوگا اور اگر مصلحت کے خلاف ہوگا تو نافذ نہیں ہوگا۔

اسی لیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج کے باب احیاء الموات میں فرمایا کہ حاکم کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے قبضے سے کوئی شے لے اِلا یہ کہ ثابت اور معروف حق کی بناء پر ہو۔ انتہیٰ قاضی خان نے اپنے فتاویٰ کی کتاب الوقف میں ذکر کیا کہ اگر سلطان شہر کی اراضی میں سے کچھ اراضی پر کچھ لوگوں کو مسجد پر موقوف دکانیں بنانے کی اجازت دے دے یا اُن کو اپنی مسجد بڑھانے کی اجازت دے دے تو اگر تو وہ شہر لڑکر فتح کیا گیا تھا اور اس کام میں گزرنے والوں اور لوگوں کا ضرر نہ ہو تو سلطان کا حکم نافذ ہوگا اور اگر شہر صلح سے فتح کیا گیا ہو تو اراضی ان کے سابقہ مالکوں کی ملک میں باقی رہیں گی اور ان میں سلطان کا حکم نافذ نہیں ہوگا۔ انتہی

علّامہ حموی رحمہ اللہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں۔

... لان من اقطعه الولاة المهدیون فلیس لاحد ان یرد ذلك الخ

"کیونکہ جو جاگیریں ہدایت یافتہ حاکموں نے عطا کی ہوں تو کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ ان سے واپس لے سکے الخ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر ہدایت یافتہ حکمرانوں کے تصرفات کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے" لیکن غیر مقامی باشندوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا اور ان کے جان و مال کا احترام نہ کرنا اس

(بقیہ بر صـ ۶۴)

حاصلِ مطالعہ

مولانا نعیم الدّین صاحب ، فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

اچھّے یا بُرے ہونے کا مدار خاتمہ پر ہے

ایک طویل حدیث شریف میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنّت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتۂ تقدیر آگے آجاتا ہے اور وہ دوزخیوں کے عمل کرنے لگتا ہے اور انجام کار دوزخ میں چلا جاتا ہے اور (اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) تم میں سے کوئی دوزخیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتۂ تقدیر آگے آجاتا ہے اور وہ جنتیوں کے عمل کرنے لگتا ہے اور جنّت میں پہنچ جاتا ہے۔"[1]

اس حدیث شریف کا تعلّق مسئلۂ تقدیر سے ہے جس پر ایمان لانا ضروریات دین میں داخل ہے، اس حدیث شریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ کسی شخص کے اچھّے یا بُرے ہونے کا فیصلہ اس کی زندگی میں نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اچھّے یا بُرے ہونے کا مدار خاتمہ پر ہے۔ اگر خاتمہ بالخیر ہوگیا تو وہ اچھّا ہے اور اگر

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۰

خدانخواستہ خاتمہ بالخیر نہ ہُوا تو بُرا ہے، حدیث شریف میں جو بات ذکر کی گئی ہے ـــــ عموماً اس کا ظہور اس عالم میں ہوتا رہتا ہے، ماضی قریب کا ایک واقعہ راقم الحرف کی نظر سے گزرا، جی چاہا ـــ کہ قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس واقعہ کا تعلق حضرت سیّد احمد شہید رحمہ اللہ (شہادت ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے اُس آخری معرکۂ جہاد سے ہے جو بالاکوٹ کے میدان میں سکھوں کے ساتھ پیش آیا تھا اور اسی میں آپ کی شہادت واقع ہُوئی تھی، تو لیجیے ملاحظہ فرمایئے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں۔

"میاں خدا بخش صاحب رام پوری کہتے ہیں کہ ضلع اجوری کا ایک شخص پنجتار سے حضرت (سیّد احمد شہیدؒ) کے لشکر میں شریک ہُوا تھا، اس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، مگر راجہ کر کے مشہور تھا، جب اس نے شیر سنگھ کا لشکر دیکھا کہ سامنے پڑا ہے خدا معلوم اس کے دل میں کیا آیا کہ یکبارگی اپنے ہتھیار لے کر لشکرِ مجاہدین سے نکل کر شیر سنگھ کے لشکر میں چلا گیا اور ان میں شریک ہوگیا، تقدیر الٰہی سے اس کے جانے کے بعد شیر سنگھ کے لشکر کا ایک سکھ حضرت کے پاس آکر مسلمان ہُوا اور غازیوں میں شریک ہُوا، حضرت نے اس کا نام عبداللہ رکھا، جس دن بالاکوٹ میں لڑائی شروع ہُوئی اور سکھوں نے غازیوں پر یورش کی تب وہ جو راجہ کر کے مشہور تھا ہتھیار باندھے سب سکھوں کے آگے تھا۔ اِدھر کی گولی اس کے لگی اور وہ وہیں مردار ہُوا، اس کے بعد سکھوں کی طرف ایک گولی اِس سکھ نومسلم کے لگی اور وہ اُسی جگہ شہید ہوگیا"[1]

تقلید "کسی شخص کی بات پر (یہ حسن ظن رکھتے ہُوئے کہ یہ صحیح بات بتلائے گا) اعتماد کر لینا اور اس سے دلیل کا مطالبہ نہ کرنا" تقلید کہلاتا ہے۔

تقلید کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) تقلیدِ مطلق (۲) تقلیدِ شخصی، تقلیدِ مطلق فرض اور تقلیدِ شخصی واجب بالغیر ہے، دونوں کے دلائل کتاب وسُنّت میں موجود ہیں۔

---

[1] سیرت سیّد احمد شہیدؒ ج ۲ ص ۴۲۴

تقلید کا وجود قرونِ اُولیٰ سے چلا آرہا ہے اور اس کی ضرورت اور اہمیّت کو ہر دور میں محسوس کیا گیا ہے، چنانچہ بڑے بڑے جبالِ علم محدّثین محققین، متکلمین اور کبار اولیاء اللہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرتے رہے ہیں۔ اس دورِ پُر فتن میں اس کی اہمیّت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ دور جہالت کی کثرت اور نیتوں کے فتور کا دور ہے جس میں نفسانیت اور انانیت عروج پر ہے جس کا سدِّ باب تقلید ہی سے ممکن ہے، لیکن کچھ لوگ تقلید کے شدّت سے مخالف ہیں اور اپنی جہالت و نادانی کے سبب تقلید کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شُبہات کا شکار ہیں اور دوسروں کو بھی اس کا شکار کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ایک بزرگ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی جو "وکیل اہلِ حدیث" کہلاتے ہیں اُن کا ایک واقعہ اور اُن کی ایک تحریر دورانِ مطالعہ راقم کی نظر سے گزری جس سے تقلید کی ضرورت و اہمیّت اور ترکِ تقلید کی مضرت اور اس کے بھیانک نتائج کا پتہ چلتا ہے، جی چاہا کہ وہ واقعہ اور تحریر نذرِ قارئین کی جائے، تو لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی (م ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء) تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی محمد حسین صاحب نے (حضرت والا[1] کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ محمد طیّب) چنانچہ مولانا موصوف حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں، اجازت دے دی گئی۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سُنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی۔ ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سُننا چاہیے۔ (میں اسی دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر یہ حضرات بیٹھے تھے، حضرت والا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھیے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمانی ہو، اس میں دو باتوں کا خیال رکھیے۔ ایک یہ کہ مسئلۂ زیرِ بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے

---

[1] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ

یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لیے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطورِ معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہیے۔ یہ بات مجھ پر حجّت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے۔ مَیں اُن کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین آمین بالجہر وغیرہ بہت سے مختلف فیہ مسائل زیرِ گفتگو آئے اور حسبِ شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہبِ احناف بیان فرماتے، اور حضرتِ والا دلائل سے اسے ثابت کرتے حضرت کی تقریروں کے درمیان مولانا محمّد حسین صاحب جُھوم جُھوم جاتے اور بعض اوقات تو جوش میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہو جاتے۔ جب گفتگو ختم ہو چکی تو، محمّد طیّب) مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"مجھے تعجّب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی باین زورِ علم و فراست و قوّت استنباط تقلید کے کیا معنی؟"

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے مَیں نے سُنا حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں،

"اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو۔ (یعنی مدعی اجتہاد ہو)" [1]

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی پہلے تقلید کے مخالف اور ترکِ تقلید کے پُرزور حامی تھے لیکن مسلسل تجربات کے بعد جب ترکِ تقلید کی مضرتوں کا احساس ہوا تو وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہدِ مطلق اور تقلیدِ مطلق کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور بعض لا مذہب جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے، اور احکامِ شریعت سے فسق و خروج تو آزادی کا ادنیٰ نتیجہ ہے ان فاسقوں میں بعض تو کھلم کھلا جمعہ، جماعت، نماز اور روزہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، سود،

---

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۳

شراب سے پرہیز نہیں کرتے اور بعض جو کسی مصلحتِ دنیاوی سے فسقِ ظاہری سے بچتے ہیں وہ فسقِ مخفی میں سرگرم رہتے ہیں، ناجائز طور پر عورتوں کو نکاح میں پھنسا لیتے ہیں ناجائز حیلوں سے لوگوں کے مال خدا کے مال وحقوق کو دبا رکھتے ہیں، کفر و ارتداد و فسق کے اسباب دُنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہوجانے کے لیے بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔"[1]

مولانا محمد حسین صاحب کے اس ارشاد کی ہم حرف بحرف تائید کرتے ہیں، موصوف نے اس سلسلے میں پیش آنے والے تجربات ذکر نہیں کیے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں جو تجربات پیش آئے ہیں اُن میں سے چند ایک ذکر کردیے جائیں۔ یہ تجربات اُنہی کے ذکر کردہ ہیں ہم صرف اُن تجربات کو نقل کر رہے ہیں۔

؎ اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات اُن کی

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی پہلے غیر مقلد[2] تھا، میاں نذیر حسین صاحب دہلوی نے اس کا نکاح پڑھایا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب کی اس سے دوستی تھی وہ اپنے رسالہ "اشاعت السنۃ" میں اس کی کتابوں پر تبصرہ لکھا کرتے تھے، لیکن ایک وقت آیا کہ وہ مدعیِ نبوّت بن بیٹھا اور مولانا محمد حسین صاحب کو اس کے خلاف پاک وہند کے عُلماء سے فتوے لینے پڑے۔

(۲) مولانا محمد حسین صاحب کے ایک دوست مولوی محمد احسن امروہی تھے اِنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی کتاب ادلۂ کاملہ کا جواب لکھا تھا اِس جواب پر مولانا محمد حسین صاحب نے اپنے رسالہ "اشاعت السنۃ" میں زبردست قسم کا تبصرہ لکھا تھا، لیکن انجام کار یہ صاحب مرزائی بن گئے اور مولانا محمد حسین صاحب کو اپنے رسالے میں ان کے خلاف لکھنا پڑا۔[3]

(۳) مولانا محمد حسین صاحب کے زمانے میں سرسیّد کی تحریک زوروں پر تھی۔ سرسیّد بھی پہلے غیر مقلد تھے[4] لیکن پھر وہ عقل پرستی کا شکار ہوگئے اور قرآن وسُنّت میں مَن مانی تاویلات کرکے بہت سے معجزات جنّت جہنّم جنات اور فرشتوں کا انکار کر بیٹھے اور نیچری فرقے کے بانی کہلائے۔

---

[1] اشاعت السنۃ ج دوم نمبر ۲ ص: ۵۱، ۵۲، ۵۳ بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۴۱۶ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے فتویٰ امام ربانی بہ مرزا غلام احمد قادیانی [3] دیکھیے اشاعت السنۃ ج ۱۴ شمارہ ۷ [4] دیکھیے ہندوستان میں اہلِ حدیث کی خدمات ص ۳۱، موج کوثر ص ۶۹، ۷۰

(۴) لاہور میں "چینیانوالی" مسجد مشہور ہے وہاں کے امام مولوی عبداللہ چکڑالوی تھے جو پہلے غیر مقلد تھے[1] پھر ترقی کر کے منکر حدیث بن گئے اور چکڑالوی فرقے کے بانی بنے، مولانا محمد حسین صاحب کو اپنے رسالے میں ان کے خلاف لکھنا پڑا۔

(۵) ایک واقعہ دو غیر مقلدوں کا مولانا محمد حسین صاحب نے اپنے رسالہ "اشاعت السنہ" میں بقلمِ خود درج کیا ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"لاہور کی مسجد چینیانوالی میں (جس کو خاکسار نے عرصہ تقریباً چالیس سال سے آباد کیا تھا) ایک اندھا پشاور سے جوتا پہن کر نماز پڑھنے کے مقدمہ کا اپیل عدالت چیف کورٹ میں لایا اور اس خاکسار کے فتوے سے کہ پاک جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، وہ اس مقدمہ میں کامیاب ہوا جب وہ اس مقدمہ میں کامیاب ہوا تو اس کو یہ مسئلہ بتایا گیا کہ جوتا پہن کر اگر وہ پاک ہو نماز پڑھنا صرف جائز و رخصت ہے، اور جوتا اُتار کر نماز پڑھنا افضل ہے، تم اس مقدمہ میں کامیاب تو ہو گئے ہو اب اس رخصت پر عمل کرنے پر اسرار نہ کرو، جو جوتا اُتار کر نماز پڑھنا افضل ہے اس پر عمل کیا کرو، تم اندھے ہو جوتے کے پاک و ناپاک ہونے کو خود دیکھ نہیں سکتے۔ تمہارے لیے احتیاط اس میں ہے کہ جوتا اُتار کر مسجد آیا کرو، اس ضدی نے اس مسئلہ احتیاط کو نہ مانا اور مسجد کے فرش پر کیچڑ بھری جوتیاں لانا شروع کر دیا اور خدّام مسجد چینیانوالی سے دو جاہل متعصّب (جن میں اخیر ایک مرزائی ہو کر خود مسجد سے نکل گیا اور دوسرا اخیر چکڑالوی کا پیرو کار ہو گیا اور جبراً مسجد سے نکالا گیا) اس اندھے کے حامی بن گئے۔ ان ضدیوں کے مقابلے کے لیے چند احباب معتقدِ خاکسار کھڑے ہو گئے اور اخیر ان کے فساد و تکرار کی رپورٹ کوتوالی لاہور میں ہوئی اور قریب تھا کہ فوجداری مقدمات عدالت تک نوبت پہنچتی اس فساد سے بچنے کے لیے خاکسار نے مسجد چینیانوالی کی امامت جمعہ و جماعت پنجگانہ ترک کر دی، اور اس اندھے متعصب کا انجام یہ ہوا کہ

(بقیہ بر صـ۶۴)

---

[1] دیکھیے موج کوثر صـ۷

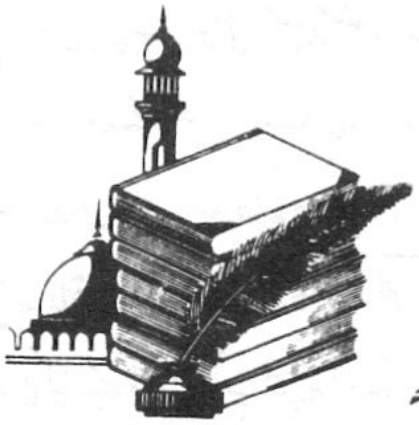

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں۔

تقریظ و تنقید

مختلف تبصرہ نگاروں کے قلم سے

نام کتاب : انوار البیان فی کشف اسرار القرآن (جلد ۴)

تصنیف : حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری دامت برکاتہم

صفحات : ۵۴۲

سائز : ۳۰×۲۰/۸

ناشر : ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

قیمت : درج نہیں۔

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب دامت برکاتہم کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اصلاحی مضامین لکھنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ تحریر میں آپ کا انداز دلکش، آسان اور ناصحانہ ہوتا ہے جس سے قاری کا دل اثر لیے بغیر نہیں رہتا۔ آپ کے قلمِ حقیقت رقم سے متعدد چھوٹی بڑی کتابیں نکل کر علماء و عوام سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے آپ کی تصنیفات میں سے اہم تصنیف تفسیر "انوار البیان فی کشف اسرار القرآن" کی چوتھی جلد ہے۔ اس جلد میں سورۂ اعراف کے بقیہ حصّہ کی تفسیر کے علاوہ (۱) سورۂ انفال (۲) سورۂ توبہ (۳) سورۂ یونس (۴) اور سورۂ ھود کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں یہ انداز اپنایا گیا ہے کہ اُوپر جلی قلم آیاتِ مبارکہ درج کی گئی ہیں۔ اُن کے نیچے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے اور اس سے متصل تفسیر بیان کی گئی ہے۔

حضرت مولانا نے یہ تفسیر انتہائی آسان انداز میں تحریر فرمائی ہے جسے معمولی استعداد والا شخص بھی باآسانی سمجھ سکتا ہے، موقع و محل کے مناسب احادیثِ مبارکہ درج فرمائی ہیں ساتھ ہی اُن کی تخریج بھی کر دی ہے

جس سے اصل مأخذ کی طرف بآسانی رجوع کیا جا سکتا ہے ایسے ہی دیگر کُتبِ تفسیر سے جہاں بھی استمداد کیا ہے حوالہ درج فرما دیا ہے، اس لحاظ سے یہ تفسیر مکمّل ہونے کے ساتھ ساتھ مدلّل بھی ہو گئی ہے۔

تفسیر اکابر و اسلاف کے مشرب و موقف کے عین مطابق ہے، نہ طول و طویل ہے اور نہ ہی بہت مختصر، نہایت متوازن تفسیر ہے۔ خوب صورت کتابت و طباعت اور لیمینیشن جلد کے ساتھ مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ قارئین ضرور اس سے استفادہ فرمائیں۔

○

نام کتاب : ماہتاب عرب صلّی اللہ علیہ وسلّم

تصنیف : حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

صفحات : ۱۷۶

سائز $\frac{۳۶ \times ۲۳}{۱۶}$

ناشر : ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

قیمت : درج نہیں

زیرِ نظر کتاب "ماہتاب عرب" حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ (م ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے ان وقیع مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ النجم لکھنؤ میں چھپتے رہے ہیں، ان وقیع مضامین کو ابتداءً حضرت مولانا نے خود اپنے اہتمام سے مجموعہ کی شکل میں شائع فرمایا تھا اور اس کی لوح پر یہ عبارت درج کی تھی۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ نسخہ مفیدہ جس میں حضراتِ انبیاء علیہم السّلام کے کارنامے اور مَساعیِ جمیلہ بالاِجمال اور سیّدِ وُلدِ آدمؑ، فخرِ عالم محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حالاتِ مُبارکہ بالتفصیل مذکور ہیں اور اس کا نام "ماہتابِ عرب" اس لیے رکھا گیا ہے کہ نظائر و واقعات سے فضیلتِ محمّدیہ اور آپ کی شریعتِ سَنِیّہ کی جامعیت اس میں چمکتی ہے اور وہ ۱۳۳۱ھ میں النجم لکھنؤ کا ماہوار جزء بنتا رہا ہے۔"

آپ نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں سے پہلے باب کا عنوان "نبوت کی ضرورت"

دوسرے باب کا عنوان "نبوّتِ محمدیہ" تیسرے باب کا عنوان "تعلیم وتربیت" چوتھے باب کا عنوان "تزکیۂ نفوس اور تکمیل" ہے۔

اسی کتاب کو نئے سرے سے ادارہ تالیفات اشرفیہ کی طرف سے شائع کیا گیا ہے، جس میں یہ جدّت کی گئی ہے کہ ایک تو اس میں مشکل الفاظ کے معانی درج کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کی مختصر سوانح شروع میں لگا دی گئی ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔ جلد پر خوبصورت ڈسٹ کور لگایا گیا ہے جس پر گنبدِ خضراء کی تصویر ہے۔

○

نام کتاب: معمولاتِ نبوی (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

تصنیف: مولانا عبدالقدوس رومی ومولانا عبدالرحمٰن جامی

صفحات: ۱۹۶

سائز: ۳۶×۲۳/۱۶

ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

قیمت: درج نہیں

جنابِ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے معمولاتِ مُبارکہ سے متعلق مختلف زبانوں میں متعدد کُتب لکھی گئی ہیں، ہر ایک کا اندازِ بیان چونکہ الگ الگ ہے اس لیے کوئی کتاب بھی فائدہ سے خالی نہیں، زیرِ نظر کتاب "معمولاتِ نبوی" صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اسی سلسلے کی ایک مُبارک کڑی ہے جو ہندوستان کے دو عُلماء کی مشترکہ کاوش ہے، اس کتاب میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روز مرہ کے معمولات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اندازِ بیان آسان ہے جس سے ہر ایک فائدہ اُٹھا سکتا ہے بعض مقامات پر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا کے حواشی درج کیے گئے ہیں جو نہایت ضروری اور مفید حواشی ہیں۔

خُوبصورت لیمنیشن جلد کے ساتھ یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

(ن — د)

محمد عابد متعلم جامعہ مدنیہ

اخبار الجامعہ

○ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ ۳ اکتوبر ۱۹۹۶ء بروز جمعرات ـــــ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے صاحبزادے حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ العلماء ہند مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور حسبِ معمول جامعہ مدنیہ میں قیام فرمایا۔

اگلے روز ۲۰ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ آپ صدیق آباد (ربوہ) میں منعقد ہونے والی ختمِ نبوّت کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور ۲۱ جمادی الاولیٰ بروز ہفتہ واپس تشریف لائے۔ ۲۲ جمادی الاولیٰ کو مختلف مقامات پر دورہ کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ حضرت نائب مہتمم صاحب اور جناب شاہد اشرف صاحب بھی سفر میں تشریف لے گئے۔ ۲۵ جمادی الاولیٰ بروز بدھ آپ کی لاہور واپسی ہوئی۔

○ اسی روز عشاء کی نماز کے بعد جامعہ کی مسجد میں حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم کی زیرِ صدارت ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس کے مہمانِ خصوصی حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی دامت برکاتہم تھے۔ جلسہ کا آغاز قاری محمد ادریس صاحب مدرس شعبۂ تجوید کی تلاوت سے ہوا، تلاوت کے بعد جناب سیّد سلمان گیلانی نے حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی مدح میں نظم پڑھی، نظم کے بعد حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحب نے مختصراً بیان فرمایا آپ کے بیان کے بعد حضرت مولانا کا بیان ہوا جس کو قارئین اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ آخر میں ششماہی امتحان منعقدہ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ میں کامیاب ہونے والے طلباء کو انعامات دیے گئے اور درجۂ حفظ کے فارغین حفاظ کو اسناد دی گئیں۔

○ اراکینِ جامعہ اپنے فارغینِ درسِ نظامی و قراءت سبعہ وعشرہ اور روایت حفص نیز فارغینِ طب اور جامعہ میں تکمیلِ حفظِ قرآنِ پاک کرنے والوں کے لیے ایک بہت بڑے جلسۂ دستار بندی اور جلسۂ تقسیم اسناد کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے کوشاں ہیں، اسی اثناء میں حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی دامت برکاتہم کی اچانک تشریف آوری ہوگئی اور وہ بھی مختصر سے وقت کے لیے اس لیے اس موقع کو

غنیمت جانتے ہوئے جن حفاظ سے عجلت میں رابطہ ہو سکا اُن کو بلا لیا گیا اور اسناد دی گئیں۔

ششماہی امتحان کے نتیجہ کا اجمالی جائزہ

کل شرکاء : ۱۶۱، ممتاز : ۷۹، جید جدًّا : ۲۸ ، جید : ۲۷، مقبول : ۱۶ ، راسب : ۳ ،

اس سال جامعہ کے ششماہی امتحان کا مجموعی نتیجہ زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ فیصد اور کم سے کم ۲۵ فیصد اور اوسطاً ۶۱ فیصد رہا۔

○ اختتامِ جلسہ کے بعد جامعہ کے زیرِ نگرانی قائم فری ہسپتال کی جدید عمارت اور عملہ و اساتذہ کے لیے نورہائشی فلیٹس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جو حضرت مولانا دامت برکاتہم نے رکھا اس موقع پر حضرت مولانا خان محمدؒ صاحب دامت برکاتہم اور دیگر معزز مہمان اور شرکائے جلسہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

بقیہ : علاقائی حقوق

علاقے کے اصحابِ اقتدار یا مقامی باشندوں کے لیے جائز نہیں کیونکہ جو زمینیں اُن کو ملیں وہ سرکاری اراضی تھیں جن پر کسی قدیم باشندے کا مالکانہ حق نہیں تھا۔ اُنھوں نے یہ زمینیں قیمت سے خرید کر یا سرکاری اجازت سے حاصل کیں حکومت نے مفادِ عامہ کے خلاف اُن کو زمینیں مہیّا کیں تو یہ حکومت کی اپنی عاقبت نا اندیشی تھی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

بقیہ : حاصلِ مطالعہ

وہ آخر عیسائی ہو کر مرتد ہو گیا۔"[1]

یہ اور ان جیسے دیگر متعدّد واقعات تھے جو مولانا محمد حسین صاحب کے تجربہ میں آئے تھے جن کی وجہ سے مجبور ہو کر اُنھیں لکھنا پڑا کہ

"پچیس ۲۵ برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہدِ مطلق اور تقلیدِ مطلق کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔"

کاش کہ موجودہ دور کے منکرینِ تقلید اپنے بزرگ کے تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے اور انکارِ تقلید سے باز آجاتے، لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

---

[1] اشاعت السنۃ ج ۲۱ شمارہ ۲ ص ۴۵

جامعہ مدنیہ لاہور کیلئے تعاون کی اپیل

جامعہ مدنیہ لاہور کا شمار ملک کے عظیم دینی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء ۷۵ھ میں ہوئی تھی۔ گویا اِس وقت جامعہ زندگی کی ۳۹ بہاریں پُوری کرکے چالیسویں میں داخل ہو رہا ہے۔ بحمداللہ اس عرصہ میں جامعہ سے سینکڑوں علماء اور کثیر تعداد میں حفاظ و قراء تیّار ہُوئے۔ بفضلہ تعالیٰ جامعہ میں درسِ نظامی درجاتِ تکمیل اور درجاتِ تجوید و قرأت عشرہ و حفظ و ناظرہ و دینیات کا مکمّل انتظام ہے۔ حتیٰ کہ طب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ طلبہ خوشنویسی بھی سیکھتے ہیں۔

اس سال تقریباً ۹۳۷ طلبہ نے قابل و لائق اساتذہ کی زیرِ نگرانی مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی، اُن میں ایک سو سے زائد طلبہ کے خورد و نوش و ظائف کپڑوں اور دیگر جملہ مصارف کا جامعہ کفیل رہا، لیکن گزشتہ چند سالوں میں ہوشربا گرانی نے اس درجہ پریشانی پیدا کر دی ہے کہ سب کارکنانِ مدرسہ اس بارے میں متفکر ہیں۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ علومِ اسلامیہ کا یہ عظیم مرکز بیش از بیش علمی خدمات انجام دے اور مہمانانِ رسول ان قدسی علوم سے بہرہ ور ہوتے رہیں تو آپ خود بھی اس نیک کام میں پُوری قُوّت سے مدد کیجیے اور اپنے احباب کو بھی اس کارِخیر میں حصّہ لینے کی ترغیب دیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب سے اپنے دینِ متین کی بیش از بیش خدمت لیں۔ آمین

ہم ہیں آپ کے مخلص

اراکینِ جامعہ مدنیہ، لاہور